میری لائبریری

کنہیا لال کپور
(مصنف: سنگ و خشت)

ڈیڑھ روپیہ

شیشہ و تیشہ

کنہیّا لال کپوؔر

مکتبہ جدید لاہور

بار اوّل　　　جولائی سنہ ۱۹۴۳ء　　　قیمت دو روپے

امرت الیکٹرک پریس میں چودھری رشید احمد کے اہتمام سے چھپ کر مکتبہ جدید لاہور سے شائع ہوئی

کرشن چندر کے نام ——————

"مقصود اِس سے قطعِ محبت نہیں مجھے"

مندرجات

پیش لفظ

کسی مفکّر کا قول ہے۔ کہ ہندوستان کو مزاح کی بجائے طنز کی زیادہ ضرورت ہے۔ حسنِ اتفاق دیکھئے۔ کہ وہ مفکر میں ہی ہوں۔ کیونکہ یہ قول میرا ہی ہے یہ علیحدہ بات ہے کہ عمل اس پر کرشن چندر بھی کرتے ہیں۔ سُنا ہے۔ کہ ایک ناول لکھ رہے ہیں جس کا نام ہے "گدھا" یہ ناول بندروں سے متعلق نہیں۔ بلکہ انسانوں کے متعلق ہے! ڈارون کہتا ہے انسان بوزنہ ہے۔ کرشن چندر فرماتے ہیں "بوزنہ نہیں۔ گدھا ہے" اب اگر آپ کہیں۔ کہ انسان نہ بوزنہ ہے نہ گدھا بلکہ باؤلا کتا۔ تو میں اس کے سوا کیا کہہ سکتا ہوں کہ ؎

فکر ہر کس بقدرِ ہمت اوست

میری ناچیز رائے میں انسان نہ بوزنہ ہے۔ نہ گدھا۔ بلکہ محض انسان۔ کیونکہ اگر وہ بوزنہ یا گدھا ہوتا۔ تو اس قسم کی مضحکہ خیز حرکات نہ کرتا۔ جو آئے دن ہم اُس سے منسوب کرتے

ہیں - طنز نگاری ادب کی مشکل ترین صنف ہے۔ نئے طنز نگاروں کی حوصلہ شکنی مطلوب نہیں۔ اپنی بڑائی یا یوں کہئے حوصلہ افزائی مقصود ہے۔ اچھی طنز اچھے شعر کی طرح کمیاب بھی ہے۔ اور نایاب بھی۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے کامیاب طنز نگار اور شاعر انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ طنز کی متعدد قسمیں ہیں۔ میں اُن سب کا ذکر کر کے آپ کا دماغ پریشان نہیں کروں گا۔ البتہ ایک "قسم" کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ وہ ہے وحشیانہ طنز۔ اس کا موجد تو یقیناً کوئی یونانی یا رومن ادیب ہوگا مگر انگریزی ادب میں جن ادبا نے اسے کامیابی کے ساتھ نبھایا۔ وہ سوفٹ (Swift) بٹلر۔ اور برنارڈ شا ہیں۔ مجھے یقین ہے۔ کہ جب تک ہندوستان میں سوفٹ اور شا پیدا نہیں ہوں گے جنسی جھجک۔ خود فریبی اور ریاکاری کا خاتمہ نہیں ہوگا۔ اس لئے میں خوش ہوں۔ کہ کرشن چندر ایک ناول لکھ رہے ہیں جس کا نام ہے "گدھا"۔ اور میں نے یہ مجموعہ لکھا جس کا نام ہے "شیشہ و تیشہ"۔ اب ہم دونوں میں سے سوفٹ کون ہے۔ اور شا کون یہ آپ خود فیصلہ کر لیجئے !!

کنہیا لعل کپور

زیبِ داستان کے لئے

انٹر کلاس کے — ایک چھوٹے سے ڈبے میں پانچ مسافر بیٹھے ہوئے یہ سوچ رہے تھے۔ کہ گاڑی کب چھوٹے گی۔ گنجے سر والے پروفیسر نے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ اگر اس گاڑی کا گارڈ میرے کالج کا طالب علم ہوتا۔ تو میں اُسے اتنی دیر گاڑی روکے رکھنے کے جرم میں بنچ پر کھڑا کر دیتا۔ بیٹھی ہوئی آنکھ والے شاعر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور میں ایسی ہجو لکھتا کہ بچہ ساری عمر یاد رکھتا۔ سُرخ چہرے والا رئیس زادہ بولا۔ میرا جی چاہتا ہے کہ مار مار کر کمبخت کا بھُرکس نکال دوں۔ عطر میں نہائی ہوئی طوائف نے کہا اگر وہ میرے ہاں گانا سننے آتا۔ تو میں دھکّے مار مار کر کوٹھے سے اُتار دیتی۔ گونگا مسافر سوچنے لگا۔ یہ لوگ خواہ مخواہ ناراض ہو رہے ہیں۔ گاڑیاں اکثر لیٹ ہو جاتی ہیں۔

خدا خدا کر کے گاڑی روانہ ہوئی۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ سیاسیات سے

لیکر جنسیات تک ہر ایک مسئلہ زیر بحث رہا۔ شاعر نے پروفیسر کے قریب سرکتے ہوئے ہوئے پوچھا۔ "آپ کی تعریف!"

"پروفیسر محمد حسین۔"

"ڈاکٹر محمد حسین؟"

"جی ہاں۔ ڈاکٹر محمد حسین۔"

شاعر نے مسرت سے اچھل کر کہا۔ "عجیب اتفاق ہے کہ میں اُردو کے مشہور ادیب شاعر اور نقاد کے ساتھ سفر کر رہا ہوں۔"

"تو آپ مجھے جانتے ہیں؟"

"آپ کو کون نہیں جانتا۔"

ڈبے کے باقی تین مسافر پروفیسر محمد حسین کو اس طرح گھور گھور کر دیکھنے لگے۔ گویا وہ کوئی عجوبہ ہیں۔ پروفیسر نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ "خاکسار ایشیا میں واحد شخص ہے جسے کیمبرج یونیورسٹی سے بی۔ اے فرسٹ کلاس کی ڈگری لینے کا فخر حاصل تھا خاکسار کے ہی پرچے پر پروفیسر کلارکورج نے جو شعبۂ انگریزی کے صدر ہیں۔ لکھا تھا۔ "یقین نہیں آتا کہ اس شخص کی مادری زبان انگریزی نہیں۔"

بیٹھی ہوئی آنکھ والے شاعر نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "تو آپ کو انگریزی زبان پر حیرت انگیز قدرت حاصل ہوگی؟"

پروفیسر نے پُر تمکنت لہجہ میں جواب دیا۔ "انگریزی؟ انگریزی میرے گھر کی لونڈی ہے۔ مجھے اُردو پر اتنا عبور حاصل نہیں ـــــ جتنا انگریزی پر لندن میں ایک دفعہ میں نے ٹائمز کیلئے مضمون لکھا تھا۔ مضمون چھپنا تھا کہ انگلستان میں تہلکہ مچ گیا۔ خود وزیر اعظم نے

مبارک باد کا تار بھیجا۔ اور ٹائمز کا ایڈیٹر تو اتنا مرعوب ہوا کہ اُس نے مجھے اسسٹنٹ ایڈیٹر کے لئے پیشکش کی۔ مگر مصروفیات کی وجہ سے مَیں نے انکار کر دیا۔ دراصل بات یہ تھی کہ اُن دنوں میں اپنا تھیس (Thesis) لکھ رہا تھا اور تھیس کے لئے آپ جانتے ہیں۔ کتنی کاوش کرنا پڑتی ہے۔ خاص کر اس موضوع کے لئے جس پر پہلے کوئی کتاب نہ لکھی گئی ہو۔ بھلا آپ ہی کہیئے۔ کیا آپ نے "صوفی شعراء کا لباس" جیسے اہم مسئلہ پر آج تک کوئی کتاب دیکھی؟ "شاعری اور اجتہاد" "شاعری اور روایات" "شاعری اور محبت" ان موضوعات پر تو ہزاروں کتابیں آپ کی نظر سے گذری ہونگی لیکن کسی محقق یا تاریخ دان نے یہ سوچنے کی کوشش بھی کی۔ کہ صوفی شعراء کس قسم کا لباس پہنتے تھے۔ اور اُس لباس کا اُن کی شاعری پر کتنا گہرا اثر تھا۔ میں کہتا ہوں۔ یہ مسئلہ جتنا پیچیدہ ہے۔ اُتنا ہی نفسیاتی موشگافیوں کا حامل بھی۔ مگر ہم میں سے کتنے ہیں جنہوں نے بنظرِ غائر اس موضوع کا مطالعہ کیا ہے اور پھر یہ مسئلہ مغربی ممالک کے لئے کتنی دلچسپی کا باعث بن سکتا ہے۔ بیچارے انگریزوں کے لئے جنہیں اتنا بھی معلوم نہیں کہ ٹیگور ہندو تھا یا مسلمان؟ مجھے ایک لطیفہ یاد آگیا۔ ایک دفعہ کیمبرج میں پروفیسر گیرڈ (Garrod) نے مجھ سے سوال کیا کہ ٹیگور کی شاعری کا طرۂ امتیاز کیا ہے۔ مجھے اس پروفیسر کی سادہ لوحی پر ہنسی آئی میں نے کہا۔ "ٹیگور کی نمایاں خصوصیت "ٹیگوریت" ہے۔ جیسے اقبال کی شاعری کا نمایاں پہلو "اقبالیت" میرا مطلب تھا۔ کہ ٹیگوریت کو ہم ٹیگور کے کلام سے اسی طرح علیحدہ نہیں کر سکتے۔ جیسے اقبالیت کو اقبال کے کلام سے۔"

شاعر نے بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔ "کیا واقعی انگلستان کے پروفیسر اتنے بے خبر ہیں؟"

"بے خبر۔" پروفیسر نے سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے کہا۔ "انہیں تو اتنا بھی معلوم نہیں کہ ہندوستان میں کوئی ادیب ہے بھی یا نہیں۔ مجھے ایک اور لطیفہ یاد آگیا۔ ایک دفعہ میں برنارڈ شا سے بات چیت کر رہا تھا۔ باتوں باتوں میں شا نے مجھ سے پوچھا۔ کہ ہندوستان کا سب سے بڑا ڈرامہ نویس کون ہے۔ میں یہ سوال سن کر حیران رہ گیا۔ اور جب میں نے اس حقیقت کا انکشاف کیا۔ کہ خاکسار کے علاوہ آغا حشر نے بھی اُردو میں دو ایک ڈرامے لکھے ہیں۔ تو اُس کی حیرت کی کوئی حد نہ رہی۔ اسی ملاقات میں ہی برنارڈ شا نے تجویز پیش کی کہ میں اُس کے چند ڈراموں کا ترجمہ اُردو زبان میں کر دوں اور وہ میرے اُردو ڈراموں کو انگریزی کا جامہ پہنائیں گے۔ چنانچہ میں نے برنارڈ شا کے مشہور ڈرامے سلور بکس (Silver Box) کا ترجمہ اُردو میں کیا۔ اسی سال میں ٹامس ہارڈی کو ملا۔ میرا خیال ہے یہ ۱۹۲۵ء کا واقعہ ہے۔ ٹامس ہارڈی کو جب میں نے اپنے انگریزی ناول کا ایک باب پڑھ کر سنایا۔ تو وہ انگشت بدنداں رہ گیا۔

شاعر نے پروفیسر کی باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔ "کسی نے بجا کہا ہے۔ ہنر کسب کمال کن کہ عزیز جہاں شوی۔ دور جانے کی کیا ضرورت ہے۔ خود میری ہی مثال لے لیجئے۔ پندرہ برس کی عمر میں جب میں نے عظیم آباد کے ایک مشاعرہ میں یہ شعر پڑھا تو ہال سبحان اللہ کے نعروں سے گونج اُٹھا۔ شعر ملاحظہ فرمایئے ؎

شام ہوتی ہے بجھ سا جاتا ہے
دل ہے گویا چراغ مسجد کا

اور صاحب جب لکھنؤ کے مشاعرہ میں میں نے یہ غزل پڑھی جس کا مطلع تھا ؎

پریشاں ہو کے میرا دل کہیں بادل نہ بن جائے — غبارِ راہ آنکھوں کا کہیں کاجل نہ بن جائے

تو امام الفن حضرت نواب محمد مختیار خان خلیل نے جو اس مشاعرے کی صدارت فرما رہے تھے مجھے اٹھ کر گلے لگا لیا۔ اسی شعر کی تعریف سن کر نواب بھوپال نے اپنے ہاں آنے کی دعوت دی۔ مگر ؎

کون جائے ذوق پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر

گو میرا وطن دہلی نہیں بلکہ مراد آباد ہے۔ مگر مراد آباد کی گلیوں کو چھوڑنا بھی تو کوئی آسان کام نہیں۔ نواب بھوپال کے بعد متعدد راجوں اور نوابوں نے مجھے بلاوے بھیجے لیکن میں نے نہ جانا تھا نہ گیا۔ ایک والئے ریاست نے تصحیح کے لئے غزل بھیجی۔ پانسو روپیہ ماہانہ وظیفہ مقرر کرنے کا وعدہ کیا۔ لیکن غیرت نے گوارا نہ کیا۔ پچھلے دنوں گورنمنٹ آف انڈیا نے پراپگینڈا ڈیپارٹمنٹ میں ایک ہزار ماہانہ کی ملازمت پیش کی۔ میری ضمیر اس پیشکش کو منظور کرنے میں مانع ہوئی۔ آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ تقریباً ہر تیسرے یا چوتھے دن مجھ سے سہرا لکھنے کی فرمائش کی جاتی ہے۔ وجہ؟ وجہ یہ ہے کہ شمالی ہندوستان کا ہر رئیس سمجھتا ہے کہ مجھ سے بہتر سہرا کوئی شاعر لکھ ہی نہیں سکتا۔ میں کہتا ہوں خوبصورت شعر کہنا بھی ایک مصیبت ہے۔"

طوائف نے اپنی زلفیں سنوارتے ہوئے چمک کر کہا: خوبصورت شعر کہنا مصیبت سہی، مگر کیا خوبصورت ہونا کم مصیبت ہے؟ میری طرف دیکھئے۔ جہاں جاتی ہوں۔ دل پھینک عشاق کا گروہ میرے پیچھے ہو لیتا ہے۔ جس شہر میں اترتی ہوں۔ وہاں خودکشیوں کی تعداد میں پچاس فیصدی اضافہ ہو جاتا ہے۔ ہندوستان کا شاید ہی کوئی راجہ یا نواب ہوگا جس نے مجھے پیغام محبت نہ بھیجا ہو۔ میں پوچھتی ہوں کہ ہندوستان کے راجوں اور نوابوں کو سوائے اس کے اور کچھ نہیں سوجھتا کہ جہاں کہیں خوبصورت عورت دیکھی۔

اس کا تعاقب شروع کر دیا۔ بیسیوں فلم ڈائرکٹر اس کوشش میں ہیں کہ میں انکی تازہ تصویر میں ہیرو کا پارٹ ادا کروں۔ سینکڑوں رئیس میری خاطر اپنی بیویوں کو طلاق دینے پر آمادہ ہیں۔ اور طالب علم!؟ طالب علموں کی تو کچھ نہ پوچھئے۔ ہزاروں کالج چھوڑنے پر تلے ہوئے ہیں۔ مجھ پر جان چھڑکتے ہیں۔ میری فوٹو کو سینے سے لگا کر رکھتے ہیں۔ پرسوں کا واقعہ ہے ایک بی۔ اے کے طالب علم نے اس لئے زہر کھا لیا کہ میں نے اس کے خط کا جواب نہیں دیا تھا۔ کیا کروں؟ میرے لئے تو جینا دوبھر ہو گیا۔ سچ کہتی ہوں جان عذاب میں ہے۔"

رئیس زادے نے خوانین کے ذرا اور قریب سرکتے ہوئے کہا۔ تم سب کی جان ضیق میں ہے۔ میں کہتا ہوں عیش تو فقط ہم ہی کرتے ہیں۔ گستاخی معاف! بہت سے لوگ تو اس پلّے سے بھی بدتر زندگی بسر کرتے ہیں جس کی زنجیر میرے ہاتھ میں ہے (ایک بلند قہقہہ لگانے کے بعد) اسے معمولی نسل کا کتا نہ سمجھئے یہ مہارانی کچھیری کی خاص کتیا کا پلا ہے ذرا بھونکتے ہوئے سنئے۔ آواز سے ریشا نہ ضبط اور امیرانہ وقار ٹپکتا ہے۔ مرحوم مہاراجہ پٹیالہ نے اسے حاصل کرنے کے لئے دس ہزار پونڈ پیش کئے۔ لیکن میں نے کہا معاف کیجئے مہاراجہ صاحب! میں بنیا مہاجن نہیں ہوں۔ یہ پگڑی جو آپ میرے سر پر دیکھ رہے ہیں میرے علاوہ ہندوستان میں صرف ایک شخص کے سر پر دیکھیں گے۔ مہاراجہ جودھپور کے سر پر اور اس انگوٹھی کے نگینے کا جواب تو ہندوستان کا بڑے سے بڑا رئیس بھی پیش نہیں کر سکے گا۔ گولکنڈہ کا قیمتی سے قیمتی پتھر اس کے آگے ہیچ ہے۔ میری ہر بات میں امتیازی خصوصیت ہوتی ہے۔ مثلاً کپڑے لندن سے سلواتا ہوں شراب پیرس کی بہترین کشید گاہوں سے منگواتا ہوں۔ ابھی پچھلے دنوں میں

نے ایک باغ لگوایا جس میں ہندوستان کے تمام مشہور پھلوں کے درخت اکٹھے کئے گئے
چنانچہ ہندوستان میں صرف میرا ہی ایک ایسا باغ ہے جس میں آپ سہارنپور کا آم مدراس
کا ناریل سرینگر کا سیب۔ کابل کا سردہ چمن کا انگور اور ڈیرہ دون کی لیچی ایک ہی قطار
میں دیکھیں گے۔ کبھی شیخوپورہ تشریف لایئے گا آپ کو باغ کی......

رئیس زادہ ابھی بات ختم نہیں کر پایا تھا کہ گاڑی بھٹنڈہ اسٹیشن پر رکی۔ پروفیسر
شاعر، طوائف اور رئیس زادے سبھوں کو یہاں گاڑی بدلنی تھی۔

اب ڈبے میں صرف گونگا فلاسفر رہ گیا تھا جب اس کے ساتھی اپنی اپنی گاڑیوں
میں سوار ہو چکے۔ تو وہ سوچنے لگا...... ڈاکٹر محمد حسین ٹامس ہارڈی کو ۱۹۲۵ء میں ملے
حالانکہ ٹامس ہارڈی ۱۹۲۰ء میں مر چکے تھے۔ پروفیسر صاحب نے شا کے ڈرامہ سلوجیکس
کا اردو میں ترجمہ کیا۔ حالانکہ یہ ڈراما شا کی بجائے گالزوردی کی تصنیف ہے۔ اور جناب
شاعر نے اپنے اشعار میں میر اور اقبال کے شعروں کا منہ چڑانے کی کوشش کی.....
بچاری طوائف پاؤڈر اور سرخی کی لیپ پوت کے باوجود اپنی عمر اور چہرے
کے داغ چھپانے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ اور رئیس زادے کے ہاتھ میں معمولی نگ کا تھا۔
...... اس کی انگوٹھی کا نگینہ بھی نقلی تھا۔

گونگا فلاسفر سوچتے سوچتے اونگھنے لگا۔ حتیٰ کہ اسے نیند آ گئی۔

شیشہ و تیشہ

(مضامینِ طنز و مزاح)

کنہیا لال کپور

کافی ہاؤس

اس زندگی سے بھاگ کر جو جھوٹ مکر اور خود فریبی کی زندگی ہے، میں کافی ہاؤس میں پناہ گزیں ہوتا ہوں، خوش باش لوگ کافی پی رہے ہیں۔ فضا قہقہوں سے گونج رہی ہے سفید وردیوں میں ملبوس بیرے صاحب لوگوں کو کافی، انڈے، پیسٹری لا کر پہنچا رہے ہیں، کافی ہاؤس میں ماسوائے ان بیروں کے کوئی اور سنجیدہ نظر نہیں آتا۔ میں بیرے کو کافی لانے کے لئے کہتا ہوں۔ اور خود ان م اش کے چند اشعار گنگنانے لگتا ہوں

زندگی سے بھاگ کر آیا ہوں میں
ڈر سے لرزاں ہوں کہیں ایسا نہ ہو۔
رقص گہ کے چور دروازے سے آ کر زندگی
ڈھونڈھ لے مجھ کو نشاں پا لے مرا۔

اور جرم عیش کرنے دیکھ لے۔

کافی کا ذائقہ ضرورت سے زیادہ تلخ ہے۔ میری دائیں طرف چند کافی نوش خوش گپیوں میں مشغول ہیں۔ میں اُن کی باتیں سننے کی کوشش کرتا ہوں۔

"پارٹی کا اخبار اور پمفلٹ فروخت کرکے صرف بارہ آنے وصول ہوئے۔"

"مگر کافی کا بل تو ایک روپیہ آٹھ آنے ہے۔"

"بارہ آنے تم اپنی جیب سے دے دو نا۔"

"میں کیوں دوں بارہ آنے۔ میں تو بعد میں آیا۔ کافی تو تم نے پی ہے۔"

"یار تم اور سب باتوں میں اشتراکی ہو۔ مگر روپے پیسے کے معاملے میں ڈھیٹ قسم کے بورژوا واقع ہوئے ہو۔"

"اچھا لاؤ بارہ آنے۔"

"ہرگز نہیں۔"

"تمہیں مس جانباز کی قسم۔"

"میری کون ہوتی ہے مس جانباز۔"

"واہ تم ہی تو اُسے پارٹی میں لائے تھے۔"

"کہتے تھے کہ وہ اشتراکیت خوب سمجھتی ہے۔"

"اگر وہ اشتراکیت سمجھ سکتی ہے تو میرے خیال میں ہر خوبصورت بلی اشتراکی ہے۔"

"کل کہہ رہی تھیں۔ مارکس کا کیپیٹل دو دن میں ختم کیا تھا۔"

"سفید جھوٹ۔"

"مارکس کا کیپیٹل چھ سو صفحے کی کتاب، اس کو پڑھنے اور سمجھنے کے لئے کم از کم

تیس سال کا عرصہ چاہیئے۔"

"تیس سال"

"جی ہاں تیس سال۔ گو میں نے اسے صرف پانچ سال میں سمجھ لیا تھا"

"میں پوچھتا ہوں کیا خیال ہے تمہارا گاندھی کے برت کے متعلق؟"

"بیہودہ۔ برت رکھنے سے ہندوستان آزاد نہیں ہو سکتا"

"اور کس طرح آزاد ہو گا"

"مارکس اور لینن کے فلسفے پر عمل کرنے سے"

"مارکس اور لینن کا فلسفہ جدا جدا ہے"

"کون کہتا ہے"

"تم نے مارکس پڑھا ہی نہیں"

"تم نے کب پڑھا ہے؟"

"اچھا۔ چھوڑو اس بحث کو۔ فرسٹ شو کیلئے دیر ہو رہی ہے"

"فرسٹ شو۔ مگر اس کے لئے پیسے کہاں؟"

"پارٹی کے چند پمفلٹ اور بیچ ڈالیں"

"اچھا خیال ہے۔ چلو اس میز سے شروع کریں۔ دس بارہ تو بک ہی جائیں گے"

چار پانچ نوجوان اٹھ کر کافی نوشوں کو ایک پمفلٹ جس کا نام "ہندوستان اور سوشلزم" ہے دکھانا شروع کرتے ہیں، چند آدمی خرید لیتے ہیں، باقی ان کا مذاق اڑانے کی کوشش کرتے ہیں۔

اب میں دوسری میز کی طرف متوجہ ہوتا ہوں، دوسروں کی باتوں میں دخل دینا

بدتمیزی سہی لیکن اگر کافی حد سے زیادہ تلخ ہو تو پھر چارہ ہی کیا ہے۔

"کونسی کتاب ہے تمہارے ہاتھ میں؟"

"بڑی دلچسپ ہے"

"لاؤ دیکھیں"

"اوہ! دلہن کی ڈائری"

"کتنے میں خریدی"

"تین روپے میں"

"مجھے پڑھنے کے لئے دوگے"

"یہ نہیں ہو سکتا میں اسے اپنے ساتھ پونا لے جارہا ہوں"

"کب جارہے ہو؟"

"اس اتوار کو"

"اچھا کوئی بیوی کی چٹھی آئی؟"

"ہاں۔ اور ایک خوشخبری بھی"

"کیا؟"

"لڑکا ہوا ہے"

"مگر تجھے تو بیوی کو ملے دو سال ہوگئے!"

"اس سے کیا ہے!"

"کافی پی کر وہاں جائیں"

"کہاں؟"

"وہاں!"

"اچھا میں سمجھ گیا۔"

"ہاں یار پونا جانے سے پہلے کچھ عیش کر لو۔"

"کل ہم نے خوب عیش کی۔"

"کتنے روپے خرچ کئے؟"

"دس۔"

"گھر کتنے بھیجے؟"

"پانچ۔"

وہ اُٹھ کر چلے جاتے ہیں، میں کافی کا ایک گھونٹ اور بھرتا ہوں۔ مگر اس کا ذائقہ تلخ تر معلوم ہوتا ہے۔ اب اس میز پہ چند کھدر پوش آ کر بیٹھ جاتے ہیں

"کمال کر دیا مہاتما جی نے۔"

"پورے تین ہفتے کچھ نہیں کھایا!"

"روحانی طاقت ہے۔"

"اوتار ہیں۔"

"میں نے تو پہلے ہی دن کہہ دیا تھا۔ کہ مہاتما جی کبھی مر نہیں سکتے۔"

"ایک دفعہ تو دنیا کو ہلا دیا۔"

"میں کہتا ہوں یہ ہے اصلی شجاعت۔"

"یہی تو میں کہتا ہوں۔ کہ اگر ہندوستان سے تمام بزدلوں کو چن چن کر مار دیا جائے، تو ہندوستان آج آزاد ہو سکتا ہے۔"

"تمہارا خیال ہے تمام بزدلوں کو گولی مار دی جائے۔"

"ہاں۔"

"تو پھر ہندوستان میں رہ ہی کون جائے گا۔"

"اچھا یار۔ میرا چرخہ کل ٹوٹ گیا ہے۔ کہاں سے مرمت کراؤں۔"

"نیا خرید دو یار۔ تمہارا چرخہ تو بہت پرانا ہو چکا۔"

"ہاں بیس سال سے اسی پر کات رہا ہوں۔"

"بیس سال۔"

"کتنا سوت کات لیا ہوگا۔"

"یہی کوئی ایک لاکھ گز۔"

"کمال کر دیا۔"

"میں کہتا ہوں۔ کہ اگر ہر ہندوستانی ایک لاکھ گز سوت کات لے۔ تو ہندوستان آج آزاد ہو سکتا ہے۔"

"مجھے اس سے بھی سہل طریقہ یاد ہے۔"

"وہ کیا۔"

"ہر ایک ہندوستانی پندرہ دن کا برت رکھ لے۔"

وہ چلے جاتے ہیں۔ اب ان کی بجائے چند کریہہ الصورت انسان میز پر قبضہ جما لیتے ہیں۔ کافی کا آرڈر دینے کے بعد وہ بحث شروع کر دیتے ہیں۔

"ادیب کہیں کا۔ اس کے سارے پلاٹ چرائے ہوتے ہیں۔"

"پلاٹ چرانا عیب نہیں۔"

"ہاں کیونکہ تم نے خود چرائے ہیں۔"

"مجھ پر ہی کیا منحصر ہے، خود شیکسپئیر نے پلاٹ چرائے ہیں۔"

"مگر ایسے نہیں جس طرح تم چراتے ہو۔"

"تم نے ابناش چندر کا ناول پڑھا؟"

"بکواس ہے۔"

"اس سے میرا ناول 'تعمیر' بدرجہا بہتر ہوگا۔"

"تعمیر! عجیب نام ہے۔"

"میں بھی ایک ناول لکھ رہا ہوں۔"

"کس کے متعلق۔"

"قیدیوں کے متعلق۔"

"مگر قیدیوں کی زندگی کے متعلق تمہیں کوئی تجربہ نہیں۔"

"اسی لئے تو میں چھ ماہ کے لئے جیل جا رہا ہوں۔"

"فرانس کا ایک ادیب بارہ سال پاگل خانے رہا۔ کیونکہ وہ پاگلوں کے متعلق ایک ڈرامہ لکھنا چاہتا تھا۔"

"سنا ہے ابناش چندر کو ناول لکھنے کا صرف چالیس روپیہ معاوضہ ملا۔"

"اور کیا جاگیر مل جاتی!"

"لکھا ہی کیا ہے اس نے۔"

"قاضی علم دین۔ . . . . . تو کہہ رہے تھے۔ کہ نہایت اچھا ناول ہے۔"

"دوست جو ٹھہرے اُن کے۔"

"قاضی اچھا آدمی ہے۔"

"نرا چغد ہے۔"

"اس لئے کہ تمہارے افسانے اپنے رسالہ میں نہیں چھاپتا۔"

"اُسے تو اتنا معلوم نہیں کہ افسانہ اور ناول میں فرق کیا ہے۔"

"وہ سمجھتا ہے۔ صرف ابناش چندر افسانے لکھ سکتا ہے۔"

"مگر تم کیوں جلتے ہو۔"

"مجھے جلنے کی کیا ضرورت ہے میں ابناش چندر سے بہتر لکھ سکتا ہوں۔"

"پھر تمہیں ابناش چندر سے کیوں حسد ہے۔"

"مجھے کسی سے حسد نہیں۔"

وہ باہر چلے جاتے ہیں میں کافی پینے کی کوشش کرتا ہوں اب اس کا ذائقہ کونین سے بھی زیادہ تلخ ہے کافی ہاؤس کی فضا میں میرا سانس گھٹنے لگتا ہے، میں کافی ہاؤس سے بھاگ کر پھر جھوٹ، مکر اور خود فریبی کی دنیا میں سانس لینا چاہتا ہوں۔

فلسفۂ قناعت

ایک انگریز انشا پرداز کا قول ہے۔ "چاک کے ٹکڑے سے لیکر خداوند تعالے تک ہر ایک چیز پر مضمون لکھا جا سکتا ہے۔" میرے دوست اکبر حسین کو اس قول سے اتفاق ہے۔ اُنکی رائے ہیں نہ صرف ہر ایک چیز پر مضمون لکھا جا سکتا ہے۔ بلکہ اسے وعظ کا موضوع بھی بنایا جا سکتا ہے۔ بات دراصل یہ ہے۔ کہ اکبر حسین بیک وقت فلسفی اور ناصح واقع ہوئے ہیں۔ زندگی کا شاید ہی کوئی شعبہ ہوگا۔ جس کے متعلق اُنہوں نے غور نہیں کیا۔ ایک دفعہ مجھے پژمردہ اور اُداس دیکھ کر کہنے لگے "بھئی ہر وقت بول بجھے ہوئے سے نظر آتے ہو۔ جیسے ابھی کسی عزیز کو دفنا کر آ رہے ہو۔ کبھی تو مسکرایا کرو۔ آخر ایسی پژمردگی بھی کیا! سنا نہیں تم نے وہ مشہور امریکن فلاسفر کا قول" جو شخص قہقہہ لگا نہیں سکتا۔ اُسے تپ دق ہے یا گنٹھیا!"

مسرت کا راز ہے قناعت۔ تم نے وہ کہانی تو سنی ہو گی۔ ایک دفعہ شیخ سعدی کے پاس جوتا نہیں تھا۔......

عموماً میں اکبر حسین کی باتیں، مجذوب کی بڑ سمجھ کر نظر انداز کر دیتا ہوں۔ لیکن اُن کے فلسفۂ قناعت میں کچھ ایسی خوبی نظر آئی۔ کہ اس کا گرویدہ ہو گیا۔ اب جس قدر اس فلسفے پر عمل کرتا ہوں۔ اسکی صداقت مجھ پر روشن ہوتی جاتی ہے۔ پہلے جب کبھی میں اپنا مُنہ آئینے میں دیکھتا۔ تو اسے زمین پر پٹک دیتا۔ لیکن اب جو اِس میں اپنی شکل دیکھ پاتا ہوں۔ خدا کا شکر بجا لاتا ہوں۔ چہرہ بُرا سہی۔ لیکن اُس لنگور سے بدرجہا بہتر ہے۔ جسے میں نے چڑیا گھر کے پنجرے میں دیکھا تھا۔ خدا قادرِ مطلق ہے۔ اگر چاہتا۔ تو مجھے لنگور بنا دیتا۔ گو اب بھی اس میں بہت تھوڑی کسر اٹھا رکھی ہے مگر الحمدللہ کہ بالکل لنگور نہیں بنایا۔ پہلے میں اپنا موازنہ لارڈ بائرن اور کلارک گیبل سے کیا کرتا تھا۔ اور مجھے یاد ہے اتنی کوفت ہوتی۔ کہ اپنا چہرہ نوچ لینے کو جی چاہتا۔ مگر اب میں اپنا موازنہ حبشیوں اور شاعروں سے کرتا ہوں اور دل ہی دل میں اپنے آپکو مبارکباد دیتا ہوں کہ مجھ سے بدصورت انسان بھی دنیا میں بستے ہیں۔ پہلے جب میری بیوی بدمزہ کھانا تیار کر کے میرے آگے رکھتی تو میں جل بھن کر کباب ہو جاتا۔ اب بجائے زہر مار کرنے کی بجائے نہایت رغبت سے کھاتا ہوں۔ مانا لاکھ بُرا سہی۔ مگر اُس کھانے سے اچھا ہے جو سنٹرل جیل میں سی۔ کلاس کے قیدیوں کو دیا جاتا ہے۔ سالن میں نمک زیادہ سہی۔ لیکن اگر میری بیوی چاہتی تو سارا نمکدان سالن میں انڈیل سکتی تھی۔

اسی طرح جب میرے پاس پہننے کو کوٹ نہیں ہوتا۔ تو میں اس بات سے مسرت حاصل کرتا ہوں۔ کہ میرے پاس قمیص تو ہے۔ اگر قمیص پھٹ جاتی ہے۔ تو یہ کہہ کر دل کو تسلی دیتا ہوں کہ بنیان تو ہے۔ اگر بنیان بھی بے وفا ثابت ہو تو خدا کا شکر بجا لاتا ہوں

کہ جسم تو ہے پچھلی سردیوں میں میرے پاس رضائی نہیں تھی۔ لیکن میں ذرا پریشان نہ ہوا۔ میں نے سوچا۔ ہزاروں گیدڑ ہر رات سردی میں ٹھٹھرتے ہیں۔ اور شور مچا مچا کر لوگوں کی نیند خراب کرتے ہیں۔ میں ان گیدڑوں سے تو اچھا ہوں۔ میرے پاس رضائی نہیں تو کیا پھٹا ہوا کمبل تو ہے۔

اکبر حسین کے فلسفے میں وصف یہ ہے کہ آپ کو ہمیشہ کوئی ایسا بدنصیب ضرور مل جائیگا جس کو دیکھ کر آپ اپنا رنج بھول سکیں اور بالفرض محال اگر کوئی ایسا انسان نہ ملے تو آپ جانوروں کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔ آوارہ کتوں کو دیکھئے بیچارے کس طرح مارے مارے پھرتے ہیں۔ چوہوں کو لیجیے۔ کتنے حقیر اور بے سروسامان نظر آتے ہیں۔ نکتہ اس فلسفہ میں یہ ہے۔ کہ آپ موازنہ کرتے وقت صحیح قسم کے شخص یا جانور کا انتخاب کریں۔ اگر آپکا انتخاب صحیح ہوگا۔ تو تمام ارضی اور سماوی آفات آپکو ہیچ نظر آئینگی مثلاً آپ کو کالی کھانسی کی شکایت ہے۔ کھانستے کھانستے دم بھول جاتا ہے۔ آپ سخت مصیبت میں مبتلا ہیں پھر بھی آپکو خدا کا شکر کرنا چاہیئے کہ آپکو صرف کالی کھانسی کی شکایت ہے۔ تپ دق نہیں اور اگر آپکو کچھ عرصہ کے بعد تپ دق ہو جائے تو پھر قبرستان کا تصور ذہن میں لائیے بلکہ اگر ہو سکے تو قبرستان کی طرف نکل جائیے اور قبروں میں سوئے ہوئے مُردوں کو پکار پکار کر کہئے "مجھے تپ دق ضرور ہے میں صبح و شام خون تھوکتا ہوں مگر میں تم سب سے بدرجہا اچھا ہوں میں ابھی چل پھر سکتا ہوں۔ ابھی میں زندہ ہوں۔" اسی طرح اگر گھر میں بوریا نہ ہو۔ تو یوں دل کو بہلائیے۔ کہ غریب خانہ یتیم خانے سے بہتر ہے اور اگر بیوی حسین نہ ہو۔ تو اُس کا موازنہ اپنے ہمسائے کی خوبصورت بیوی سے مت کیجیے۔ بلکہ بدصورت مہترانی سے۔ اور اگر بدقسمتی سے مہترانی بھی بیوی سے حسین ہو۔ تو چڑیل کے ساتھ۔ آخر کوئی تو ایسی عورت ہوگی جس سے آپ کی بیوی کم بدصورت ہے

یونہی سہی۔ پھر آپ کیوں دل میلا کرتے ہیں۔ اگر آپ کی تنخواہ کم ہے۔ آپ کی اولاد بدتمیز ہے۔ آپ کی صحت کمزور ہے۔ تو کیا غم ہے۔ آپ سے کم تنخواہ پانے والوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے اور دنیا میں ایسے بدتمیز لڑکے ہیں۔ جن کے مقابلہ میں آپ کے بچے تو عین شریف زادے ہیں۔ اور کمزور انسان! ذرا گرد و پیش نظر ڈالئے۔ آپ کو ایسے مریل انسان ملیں گے جن کے مقابلہ میں آپ رستم زماں ہیں۔

بھئی آپ کچھ ہی کہیں۔ اکبر حسین کا فلسفہ ہے بڑے مزے کی چیز۔ صرف اتنی احتیاط کیجیے۔ کہ اپنا موازنہ اغلوک کمار یا سیٹھ گھنشیام داس برلا سے نہ کر بیٹھیے۔ ورنہ ساری رات نیند نہ آئے گی۔ ہاں اگر آپ واقعی مسرت کے طالب ہیں۔ تو اپنا مقابلہ اُس یتیم لڑکے سے کیجیے۔ جسے تین دن سے روٹی نصیب نہیں ہوئی۔ یا اُس لنگور سے جو چڑیا گھر کے آہنی پنجرے میں بند ہے۔ اور جسے دیکھ کر میں خدا کا شکر بجا لاتا ہوں کہ خدا نے مجھے لنگور نہیں بنایا!

کامریڈ شیخ چلّی!

ایک روز قبرستان سے میرا گذر ہوا۔ ایک قبر بہت پسند آئی اُس کے قریب گیا۔ اور سرِ مزار کھڑا ہو کر قبر کے ثبات اور عالم کی بے ثباتی پر غور کرنے لگا۔ معاً نظر لوحِ تربت پر پڑی۔ لکھا تھا "شیخ چلی رحمت اللہ علیہ کا مزار۔" آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور ہاتھ بے اختیار فاتحہ پڑھنے کو اُٹھے۔ آہ! شیخ چلی۔ ہندوستان کا سب سے بڑا مفکر۔ تو ہندوستان سے کیا گیا۔ خیالی پلاؤ پکانے کا سلسلہ ہی ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔ پلاؤ پہلے ہی ہندوستان میں کم ملتا تھا۔ مگر اب ہم خیالی پلاؤ سے بھی محروم ہو گئے۔

یک تحت مزار سے صدا آئی "ارے بی! تم غلطی کر رہے ہو۔ شیخ چلی ابھی زندہ ہے اور ہر جگہ موجود۔" میں نے حیران ہو کر کہا۔ "شیخ چلی یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ ظالم! قبر میں لیٹ کر بھی خیالی پلاؤ پکانے سے باز نہیں آتے۔" شیخ چلی نے جواب دیا۔ "شیخ چلی ہر شخص کے

دماغ میں رہتا ہے۔ اگر تم اپنے دل و دماغ کا جائزہ لو۔ تو ضرور مجھے اپنے دِل کے کسی گوشہ میں چھپا ہوا پاؤ گے۔"

میں نے مسکرا کر کہا "شیخ صاحب آپ استعاروں میں گفتگو کرنے لگے۔ میں تو آپ کو دنیائے آب و گل میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں آپ کو اپنے دل کے گوشہ میں نہیں بلکہ جسدِ خاکی میں دیکھنے کا خواہشمند ہوں۔"

شیخ چلّی نے چلّا کر کہا۔ "یہ کوئی مشکل بات نہیں۔ کیا تم مجھے آج شام مال روڈ کے قہوہ خانہ کے باہر مل سکتے ہو؟" میں نے جواب دیا۔ "مجھے آپ سے مل کر بہت خوشی ہوگی۔" شیخ چلّی سے رخصت ہو کر میں گھر کی جانب روانہ ہوا۔ راستے میں شیخ چلّی کے اس فقرہ پر غور کرتا رہا۔ کہ شیخ چلّی ہر شخص کے دماغ میں رہتا ہے۔ اچانک مجھے ایک اپنا شاعر دوست یاد آیا جو اکثر اپنے مستقبل کے متعلق اس قسم کے ہوائی قلعے بناتا ہے۔ کہ میری شاعری آج سے ایک ہزار برس بعد کی شاعری ہے۔ اس لئے اسے ہندوستان میں صرف دو تین آدمی سمجھ سکتے ہیں۔ اور جب میرا باتصویر دیوان آرٹ پیپر پر شائع ہوگا۔ تو لوگ بالِ جبریل اور مرقع چغتائی کو بھول جائیں گے۔ اور معًا مجھے اس فلسفی کا خیال آیا۔ جو مجھے دہلی میں ملا تھا۔ اور جس نے کہا تھا۔ کہ میں نے اپنی کتاب میں آئن سٹائن کے نظریۂ اضافیت کی اس خوبی سے تردید کی ہے۔ کہ نوبل پرائز کمیٹی کے ممبر حیران رہ جائیں گے۔ اسی قبیل کا میرا ایک اور دوست تھا۔ پنڈت شرما اس کا دعویٰ تھا کہ اس کی شرما نجلی کے مقابلہ میں ٹیگور کی گیتانجلی کا رنگ پھیکا پڑ جائے گا اور خود میں نے کتنی دفعہ عجیب و غریب خیالی پلاؤ پکائے ہیں۔ کبھی کرسی پر بیٹھے بیٹھے سارے یورپ کی سیر کر ڈالی تو کبھی گھاس پر لیٹے لیٹے آسمان کے تارے توڑ لایا

شیخ چلی سچ کہتا تھا۔ ہم سب شیخ چلی ہیں۔ اچانک میں نے اپنے آپ کو مال روڈ کے قہوہ خانہ کے دروازے پر کھڑا پایا۔ دیکھا کہ ایک لمبا تڑنگا نوجوان اپنے قد سے چار گنا لمبا جھنڈا اٹھائے غلیظ گاڑھے کا لباس پہنے دروازے کے پاس کھڑا ہے چہرہ دھوپ سے جھلسا ہوا روکھے سوکھے بال ماتھے پر بکھرے ہوئے آنکھیں لال لال اور ڈراؤنی۔ گال پچکے ہوئے مجھے دیکھتے ہی مسکرا یا۔ جیسے مجھ سے جان پہچان ہو۔ میں نے جونہی اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ تو اس نے انگلی سے اپنی کشتی نما ٹوپی کی طرف اشارہ کیا جس پر سرخ سیاہی سے لکھا ہوا تھا "کامریڈ شیخ چلی" دوسرے لمحے میں وہ مجھ سے بغلگیر ہو رہا تھا "آیئے قہوہ پیجئے" اس نے مجھے مدعو کرتے ہوئے کہا۔ ہم دونو قہوہ خانہ میں داخل ہوئے۔

"تو آپ کی خواہش پوری ہوگئی" اس نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"یہ کیا مذاق ہے" میں نے ترشروئی سے کہا "یہ کیا سوانگ بنا رکھا ہے آپ نے"

"گھبرایئے نہیں" اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا "شیخ چلی کو اشتراکی کے بھیس میں دیکھئے"

"اچھا۔ تو اب یہ سودا سمایا ہے کیا!" اوہے میں ابکی بار۔ قصے کہانیوں میں تو مشہور ہے کہ آپ کی سب سے بڑی خواہش وزیر کی لڑکی سے شادی کرنا تھی۔ اب کیا خیال ہے"

"وزیر کی لڑکی سے شادی کرنے کا خیال بورژوا خیال ہے۔ اب میں اس قسم کے فضول خیالات سے سخت نفرت کرتا ہوں"

"بورژوا! اجی شیخ صاحب۔ یہ بورژوا کیا بلا ہے"

"عجب احمق ہو تم" شیخ چلی نے بگڑ کر کہا "اتنا بھی معلوم نہیں۔ ابھی تم پوچھو گے کہ

کہ پرولتاری کا کیا مطلب ہے؟"

"سچ تو یہ ہے کہ مجھے پرولتاری کے معنی بھی نہیں آتے۔"

"تب تم نرے گاؤدی ہو۔ دیکھو دنیا کی ہر چیز یا بورژوا ہے یا پرولتاری۔"

"مگر ان دونوں میں فرق کیا ہے؟"

"فرق! فرق یہ ہے کہ جو چیز بورژوا نہیں وہ پرولتاری ہے۔ اور جو پرولتاری نہیں بورژوا ہے۔"

"واہ کیا تشریح فرمائی آپ نے۔"

"بھائی یہ تو سیدھی سی بات ہے۔ دنیا کی ہر نفیس، ملائم، شفاف چیز بورژوا ہے۔ اور ہر غلیظ سخت، اور بدصورت چیز پرولتاری۔"

"مثلاً؟"

"مثلاً یہ کہ پھول بورژوا ہے، کانٹا پرولتاری۔ کھانڈ بورژوا ہے گڑ پرولتاری، ریشم بورژوا ہے کاٹھا پرولتاری۔"

"اچھا تو قہوہ کے متعلق کیا خیال ہے؟" میں نے میز پر رکھے ہوئے قہوہ کے پیالے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"قہوہ خالصتاً پرولتاری ہے۔ دیکھئے اس طرح ہے کہ شراب بورژوا ہے اور چائے پرولتاری۔ چائے سے زیادہ قہوہ پرولتاری ہے کیونکہ سستا ہے۔"

"اور قہوہ سے زیادہ پرولتاری میونسپل نل کا پانی۔ کیونکہ بالکل مفت ملتا ہے۔"

"واللہ تم خوب سمجھے۔" شیخ چلی نے میری پیٹھ ٹھونکتے ہوئے کہا

"خیر یہ تو ہوا۔ اب شیخ صاحب یہ فرمائیے کہ آپ کے منصوبے کیا ہیں؟"

"میرے منصوبے!" شیخ نے فخر سے سر اٹھاتے ہوئے کہا۔ "میرے منصوبے ہیں ہندوستان سے بورژوا تہذیب بورژوا ذہنیت بورژوا تمدن کا قلع قمع کرنا۔"

"وہ کس طرح۔ قہوہ کے پیالے پی پی کر!"

"ابھی نہیں۔" شیخ نے ذرا تنک کر کہا۔ "خون کے دریا بہا بہا کر۔"

"خون کے دریا؟"

"جی ہاں خون کے دریا۔ ابھی مستقبل قریب میں یہاں خون کے دریا بہیں گے۔"

"میرے اللہ۔" میں نے اپنا سر پکڑتے ہوئے کہا۔ "تو آپ لوگوں کا خون کریںگے کیا میں پولیس کو خبر کر دوں۔"

"ہاں ہاں۔ ہزاروں کا خون۔ لاکھوں کا خون اور اگر ضرورت پڑی تو کروڑوں کا خون۔"

"اس سے فائدہ؟"

"اس سے فائدہ یہ کہ اس کمبخت سرزمین کے گناہ جسے تم ہندوستان کے نام سے پکارتے ہو تب تک نہیں دُھل سکتے۔ جب تک یہاں خون کی ندیاں نہ بہائی جائیں"۔

"کس کس کا خون کریں گے آپ؟"

"اپنے سوا تقریباً سب کا۔ مگر سب سے پہلے۔"

"ہاں ہاں۔ سب سے پہلے" میں نے گھبرا کر پوچھا۔

"سب سے پہلے بوڑھے لیڈروں کا۔"

"اس کے بعد؟"

"بزدلوں اور غداروں کا۔"

"اس کے بعد"

"ملاؤں اور پنڈتوں کا"

"مگر شیخ صاحب ان بچارے بڑھے لیڈروں نے آپ کا کیا بگاڑا ہے؟"

"یہی تو آزادی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ یہ سٹھیائے ہوئے کھوسٹ یہ مہاتما۔ یہ پنڈت۔ یہ مولانا۔ یہ بزدل لیڈر جنہیں خون سے ڈر لگتا ہے۔ اور جو خون کی بجائے ہندوستان میں شہد اور دودھ کی نہریں بہانا چاہتے ہیں۔ یہ سب کٹھ پتلیاں ہیں جو سرمایہ داروں کے اشاروں پر ناچ رہی ہیں"

"تو آپ کا مقصد ان سے لیڈرشپ چھیننا ہے"

"ہاں مگر ذاتی اغراض کے لئے نہیں بلکہ قومی مفاد کے لئے"

"مگر کیا ان کی لیڈرشپ اور آپ کی لیڈرشپ میں فرق ہوگا"

"زمین و آسمان کا فرق۔ دیکھئے سب سے بڑا فرق تو یہی ہے۔ کہ وہ اوپر سے نیچے کی طرف انقلاب لانا چاہتے ہیں۔ اور ہم نیچے سے اوپر کی طرف انقلاب لیجانا چاہتے ہیں"

"اس اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر کا مطلب؟"

"یار تم بھی ایک ہی ہو۔ اتنا بھی نہیں جانتے کہ نیچے سے مطلب جنتا ہے۔ اور اوپر سے مطلب سرمایہ دار"

"جنتا یعنی؟"

"جنتا یعنی عوام۔ یعنی عامتہ الناس یعنی ہم تم"

"مگر شیخ صاحب جنتا تو ابھی ان پڑھ ہے۔ جاہل ہے۔ توہمات میں پھنسی ہوئی ہے

ڈرپوک ہے۔"

"یہ صحیح ہے مگر کامریڈ لینن کہتا ہے۔ کہ جنتا ہمیشہ ایسی ہوتی ہے خیر کوئی بات نہیں اگر ادھر جنتا کمزور ہے تو ادھر ہماری اشتراکی پارٹی مضبوط ہے۔ پارٹی کی طاقت ہر روز بڑھ رہی ہے۔ اور اب تو اس کے ارکان میں نصف سے کچھ ذرا کم عورتیں بھی ہیں۔ یہ اسکی مضبوطی کا ایک اور ثبوت ہے اور ہاں تم سن کر خوش ہو گے۔ کہ پارٹی کا اپنا اخبار بھی ہے جس کی اشاعت تین سو کے قریب جا پہنچی ہے۔ اور اگر پارٹی کے ممبر اسی تن دہی کیساتھ چوراہوں پر کھڑے ہو کر اسے بیچتے رہے تو شاید اسکی اشاعت چار سو بھی ہو جائے۔"

"مگر آپ جنتا کے لئے کیا کر رہے ہیں؟"

"اجی صاحب یہ سب کچھ جنتا کے لئے ہی تو ہے۔ دیکھئے ہم سال میں ایک بار دیہات میں کیمپ لگاتے ہیں۔ جی کڑا کر کے سرسوں کا ساگ اور مکی کی روٹی بھی کھاتے ہیں۔ کسانوں کی بولی سمجھنے اور انہیں اپنے خیالات سمجھانے کی کوشش بھی کرتے ہیں اور جب باوجود کوشش کے ایک دوسرے کو نہیں سمجھ سکتے تو واپس آجاتے ہیں اس سے زیادہ ہم کیا کر سکتے ہیں۔"

"اچھا۔ تو آپ کے خیال میں انقلاب آپ کی پارٹی لائے گی یا جنتا؟"

"دونوں، دیکھئے اشتراکی پارٹی دن بدن زور پکڑ رہی ہے۔ گو آج اسکی تعداد دو چار سو آدمیوں سے کم نہیں مگر جنوری انیس سو چالیس میں اسکی تعداد ایک ہزار ہو جائے گی اور مارچ میں پانچ ہزار اور اگست میں بیس ہزار حتیٰ کہ دسمبر انیس سو ساٹھ میں اسکی تعداد تین کروڑ تک جا پہنچے گی تین کروڑ ذرا خیال کرو تین کروڑ دنیا کی سب سے بڑی پولیٹیکل پارٹی!"

آہستہ آہستہ یہ پارٹی میونسپل الیکشن لڑنا شروع کرے گی اس کے بعد اسمبلی کیلئے اُمیدوار کھڑے کریگی۔ کونسلوں پر قبضہ کرتے ہی یہ سرخ فوج تیار کرنیکا کام اپنے ہاتھ میں لے گی آہ کامریڈ! وہ دن کتنا مبارک ہوگا جب ہماری پارٹی ایک کروڑ نوجوانوں کی فوج تیار کرکے سرمایہ داری کے قلعہ پر حملہ بول دیگی۔"

"مگر اس فوج میں آپ کی حیثیت کیا ہوگی"۔

"مگر میری حیثیت" شیخ نے طمطراق کے ساتھ کہا۔ "یقیناً میری حیثیت سپہ سالار کی ہوگی۔ میں ہندوستان کا لینن ہوں گا میرے ادنےٰ سے اشارے پر لاکھوں سرمایہ دار کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔ ہزاروں نوابوں کو گولی کا نشانہ بنا دیا جائے گا۔ لاکھوں جاگیرداروں کو پھانسی کے تختہ پر لٹکا دیا جائیگا۔ میں حکم دوں گا "فائر!" اور کروڑوں غداروں کے سر ہوا میں اُڑتے ہوئے نظر آئیں گے"۔

"اس کے بعد کیا ہوگا"۔

"اس کے بعد انقلاب۔ پُرانے نظام کے پرخچے اڑیں گے۔ سُرخ جھنڈا لہرائیگا۔ سُرخ آندھی چلے گی۔ نہ کوئی جاگیردار ہوگا۔ نہ نواب نہ رائے بہادر نہ خانصاحب نہ بڑی توندوں والے سیٹھ نہ بھونڈی شکل والے سرمایہ دار نہ مسجد نہ مندر نہ مُلّاں نہ پنڈت بس جنتا ہوگی۔ جنتا۔ مساوات مکمل مساوات ہر ایک شخص کام کرے۔ ہر ایک شخص آرام کرے اور ہر شخص کو طعام ملے"۔

"اور بالفرض" میں نے جرأت کرکے پوچھا۔ "شیخ صاحب اگر اسوقت کوئی نواب یا سرمایہ دار آپ کے پاس جان بخشی کی درخواست لیکر آئے تو آپ اس کے ساتھ کیا سلوک کریں گے؟"

میں اس سالے کو اس زور سے لات ماروں گا۔ کہ اس کی بتیسی باہر آپڑے گی"
اور یہ کہتے ہی شیخ صاحب نے زور سے دولتی چلائی تو سامنے رکھی ہوئی میز اور اس پر پڑے
ہوئے قہوے کے پیالے دس گز کے فاصلے پر جا رہے ہیں۔ گرم گرم قہوہ کے چھینٹے اڑ کر چار پانچ
شریف قہوہ نوشوں کے منہ اور کپڑوں پر جو گرے تو قہوہ خانہ میں تہلکہ سا مچ گیا۔ کسی نے کہا
سودائی ہے کسی نے کہا دیوانہ تمام لوگ ہماری طرف بھاگتے دکھائی دیئے۔ شیخ چلی نے
نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ کونے میں سے اپنا جھنڈا اٹھایا۔ چوکڑی بھری اور ہوا ہو گئے۔ اب
جنتا ان کا تعاقب کر رہی تھی۔ اور میں جنتا کو چلا چلا کر کہہ رہا تھا " ارے لوٹ آؤ کیوں
مفت میں پاؤں تھکاتے ہو۔ یہ تو کامریڈ شیخ چلی تھے۔ کامریڈ شیخ چلی!"

شیشہ و تیشہ

(مضامینِ طنز و مزاح)

کنہیا لال کپور

بلیک اینڈ وائٹ

(Black And White)

"تو پہلی بات جو میں ہندوستانیوں کے متعلق جانتی ہوں" اس نے چائے بناتے ہوئے کہا۔ "یہ ہے۔ کہ تمام ہندوستانی چور ہوتے ہیں۔"

"چور!" میں نے دزدیدہ نگاہوں سے اُس کے نیم برہنہ سینے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں میڈم؟"

اُس نے میری حرکت کو نظرانداز نہ کرتے ہوئے دُہرایا۔ "چور۔ سو فیصدی چور۔"

دل ہی دِل میں مجھے اُس کی بے باکی پر غصّہ آیا - کتنا سطحی مشاہدہ ہے اس عورت کا۔ میں نے سوچا۔ اور جب یہ لندن واپس جائیگی۔ تو ہندوستانیوں کے خلاف اس قسم کی غلط افواہیں پھیلا کر ہر ایک انگریز کو بدظن کرنے کی کوشش کرے گی۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ تمام ہوٹلوں کے مالک اپنے ہوٹلوں پہ یہ سائن بورڈ لٹکا دیں گے۔ "اس ہوٹل میں ہندوستانیوں

کا داخلہ ممنوع ہے۔"

میں نے صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے کہا۔" یقیناً میڈم۔ آپ زیادتی کر رہی ہیں۔ دیکھئے نا۔ اگر آپ کا بیرا سبزی یا گوشت خریدتے وقت چار پانچ آنے کی رقم ہضم کر جائے۔ یا کسی انتقامی جذبہ کے زیر اثر آپ کے سیگرٹ کیس سے دو چار سیگرٹ اڑا لے۔ تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ تمام ہندوستانی چور ہوتے ہیں۔"

"میرا یہ مطلب نہ تھا۔" اُس نے اپنے سیگرٹ کیس پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"تو شاید آپ کا یہ مطلب ہے۔ کہ اگر کوئی بے وقوف ہندوستانی طالب علم لندن کی کسی لائبریری سے ایک آدھ کتاب یا کسی رسالہ سے دو چار تصاویر چراتا ہوا پکڑا جائے تو آپ کو یہ کلیہ بنانے کا حق ہے کہ تمام ہندوستانی عادی چور ہوتے ہیں۔"

"نہیں۔ یہ بھی میرا مطلب نہیں۔"

"تو پھر؟"

"ہر ہندوستانی" اُس نے سیگرٹ کا کش لگاتے ہوئے کہا۔" کسی نہ کسی قسم کی چوری کرتا ہے۔ اگر وہ ادیب ہے۔ تو مغربی ادبا کے شاہکار چُراتا ہے۔ اگر کسی کمپنی کا ڈائریکٹر ہے۔ تو حصہ داروں کا روپیہ۔ اور اگر کلرک ہے۔ تو دفتر سے کاغذ سیاہی پنسلیں وغیرہ"

"مگر اس قسم کی چوریاں تو سفید جلد کے آدمی بھی کرتے ہوں گے۔"

"سفید جلد کے آدمی اور چوری!" اُس نے چمک کر کہا۔" یہ سراسر جھوٹ ہے۔ بالکل جھوٹ یا جیسا کہ انگریزی میں کہتے ہیں۔ سفید جھوٹ!"

"خیر جانے دیجئے اس بات کو۔ مجھے یہ بتایئے۔ کہ اگر کوئی کسی کی جاہ و ثروت کو..................

"اب آپ سیاسیات پر اُتر آئے" اُس نے بات ٹالتے ہوئے کہا "اچھا چھوڑیئے یہ قصہ"

دو چار منٹ مکمل سکوت کا عالم رہا۔ اِس عرصہ میں مَیں چھت کی طرف اور وہ میرے منہ کی طرف دیکھتی رہی۔ اُس نے دُوسرا سگریٹ سلگایا۔ اور ایک لمبا کش لگاتے ہوئے بولی " ہاں۔ تو دوسری بات جو میں آپ سے کہنا چاہتی ہوں۔ وہ یہ ہے کہ ہندوستانی حد سے زیادہ شور مچاتے ہیں"

اب کے بار میں کچھ جھینپ سا گیا۔ مجھے یوں معلوم ہُوا۔ گویا اِس الزام کا مجھ سے کچھ جواب نہ بن سکے گا۔ میں سوچنے لگا۔ کہ شور وغل کو واقعی ہماری زندگی میں کتنا دخل ہے دراصل یہ ہمارا محبُوب ترین شغل ہے۔ مجھے لیجسلیٹو اسمبلی کا وہ اجلاس یاد آگیا۔ جہاں میں ایک دفعہ موجود تھا۔ میں نے دیکھا کہ مجلس کے ارکان گلا پھاڑ پھاڑ کر شور مچا رہے تھے اور صاحبِ صدر چلّا چلّا کر اُنہیں خاموش رہنے کو کہہ رہے تھے۔ شور وشغب کا یہ عالم تھا۔ کہ اگر میں اپنی جگہ پر کھڑا ہو کر ہر ایک ممبر کو گالیاں دینا شروع کر دیتا۔ تو کسی مداخلت کے بغیر یہ شغل جاری رکھ سکتا۔ دراصل مجلس کے رُکن تقاریر کم کرتے اور گالیاں زیادہ دے رہے تھے۔ کمینہ۔ بدذات۔ احمق ایسے الفاظ کا نہایت فراخدلی کے ساتھ استعمال کیا جا رہا تھا۔ معًا مجھے یاد آیا۔ کہ ہماری مجالس میں کس قدر شور مچایا جاتا ہے اور درسگاہوں میں۔ میلوں میں۔ سینما ہال میں فلم کے شروع ہونے سے پہلے۔ کسی میّت پر بین کرتے وقت۔ گذشتہ ہفتہ میرے ہمسائے میں ایک بوڑھے کی موت واقع ہوگئی۔ اُس کے لواحقین نے چیخ چیخ کر نہ صرف مجھے بلکہ میلوں تک کسی آدمی کو رات بھر سونے نہیں دیا تھا۔ اور کل شام میں نے چند خوش باش لوگوں کو سڑک پر چلتے وقت اس طرح

شور مچاتے دیکھا تھا۔ کہ مجھے کچھ شرم سی آنے لگی تھی۔ وہ از راہِ تمسخر ایک دوسرے کو بلند آواز میں گالیاں دے رہے تھے ۔۔۔۔۔ چنانچہ میں نے اعترافِ شکست کرتے ہوئے کہا۔ "میڈم۔ یہ بات ایک حد تک صحیح ہے۔ ہم ہندوستانی ذرا فریادی قسم کے انسان واقع ہوئے ہیں۔ ہم خاموشی کی نسبت نالہ و شیون کے قائل ہیں۔ آپ لوگ ہوٹلوں میں اور سڑک پر چلتے وقت سرگوشی کے انداز میں بات چیت کرتے ہیں۔ جس سے شبہ ہوتا ہے۔ کہ آپ ایک دوسرے کے خلاف سازش کر رہے ہیں ہمیں یہ پسند نہیں۔ چنانچہ ہم جو بات کہتے ہیں۔ علانیہ کہتے ہیں۔ تاہم کبھی کبھی تو آپ شور مچانے میں ہندوستانیوں کو بہت پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔" "مثلاً" اُس نے اظہارِ تعجب کرتے ہوئے پوچھا۔ "مثلاً گاتے وقت۔ یا پھر گرجا گھر میں مل کر عبادت کرتے وقت یا جب آپ کرکٹ کا میچ یا گھوڑ دوڑ دیکھ رہے ہوں۔"

وہ قہقہہ لگا کر ہنسنے لگی۔ میں نے بیرہ کو اور چائے لانے کا آرڈر دیا۔

"اچھا۔ تو آپ ہندوستانیوں کے متعلق اور کیا جانتی ہیں؟"

"جانتی تو بہت کچھ ہوں۔ مگر آپ کی ناراضگی کا خیال ہے۔"

"میں اتنا زود رنج نہیں۔"

"تو میں یہ کہوں گی۔ کہ ہندوستانی مرد بالعموم اور ہندوستانی عورتیں بالخصوص حد سے زیادہ بزدل اور ڈرپوک واقع ہوئی ہیں۔"

مجھے یوں معلوم ہوا گویا اُس نے میرے منہ پر چٹاخ سے طمانچہ مارا ہو۔ "میڈم" میں نے ذرا ترشروئی سے کہا۔ "آپ ہندوستانی عورتوں کے متعلق بیشک جو چاہیں کہہ سکتی ہیں۔ مگر اُن پر بزدلی کا الزام نہیں لگا سکتیں۔ ضرورت پڑنے پر ہندوستانی

عورتیں جان پر کھیل جاتی ہیں۔ یقیناً آپ نے بہادر راجپوت عورتوں کے کارنامے پڑھے ہوں گے۔ ستی کی رسم کا سارے یورپ میں جواب نہیں۔"

"ہندوستانی عورتیں" اُس نے حقارت آمیز لہجے میں کہا" موت سے بیشک نہ ڈریں۔ مگر چوہوں اور خاوندوں سے ضرور ڈرتی ہیں۔ اس کے علاوہ مرد کے بغیر سفر کرنے سے کتراتی ہیں۔ اندھیرے میں جانے سے خوف کھاتی ہیں۔ بھوت اور چڑیلوں سے نہ صرف خود ڈرتی ہیں۔ بلکہ اپنے بچوں کو بھی ڈراتی ہیں۔ اور سانپ یا بچھو کو دیکھ کر چیخ اٹھتی ہیں۔

"آپ مبالغہ سے کام لے رہی ہیں۔"

"مگر بزدلی صرف عورتوں تک محدود نہیں۔" اُسنے میری طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا "ہندوستانی مرد بھی تو غایت درجہ بزدل واقع ہوتے ہیں۔"

میں نے اپنی جنس کے حقوق کی حفاظت کرتے ہوئے کہا" یہ سراسر بہتان ہے۔ کذب وافترا ہے۔ ہندوستانی سورماؤں کی شجاعت کا لوہا تمام دنیا مانتی ہے گذشتہ اور موجودہ جنگ میں ہندوستانی سپاہیوں نے بہادری کے نئے ریکارڈ قائم کئے۔"

"مگر ان تمام باتوں کے باوجود ہندوستانی ڈرپوک ہیں۔"

"کیسے؟"

"وہ یوں۔ کہ تمام ہندوستانی ایک دوسرے سے ڈرتے ہیں۔ مثلاً اچھوت ہندوؤں سے ڈرتے ہیں۔ ہندو مسلمانوں سے مسلمان انگریزوں سے!"

"اور کیا انگریز کسی سے نہیں ڈرتے؟"

"ہرگز نہیں۔"

"سُرخ خطرہ" سے بھی نہیں؟"

"سُرخ خطرہ پر لعنت" اُس نے شوخی سے کہا۔

"اور" زرد خطرہ" کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟"

"آپ پھر فضول باتیں کرنے لگے"

چند ثانیے خاموشی میں گذرے۔ وہ اپنے بال سنوارنے لگی۔ اور میں اُس کے کُتّے کو پچکارنے لگا۔

"ہاں تو آخری بات جس کا میں آپ سے ذکر کرنا چاہتی ہوں۔ وہ یہ ہے کہ ......" یک لخت وہ رُک گئی۔

"کہیے کہیے"

"آپ بُرا تو نہ مانیں گے"

"ہرگز نہیں"

"تو وہ بات یہ ہے کہ ہندوستانی ضرورت سے زیادہ بچے پیدا کرتے ہیں"

اِس بار پھر مجھے خجالت کا اِحساس ہوا۔ آخر اِس شوخ اور چابکدست لڑکی کا مشاہدہ اتنا سطحی نہیں جتنا میں نے سمجھا تھا۔ وہ ایک حقیقت کا اظہار کر رہی تھی۔ آپس میں لڑنے جھگڑنے کے بعد بچے پیدا کرنا ہی تو ہماری سب سے بڑی دل لگی ہے خود میں نے سات سال کی ازدواجی زندگی میں ...... خیر میں تو ابھی اِس معاملے میں نوگرفتار ہوں۔ میرے ایک دوست ہیں۔ جو کسی دفتر میں ملازم ہیں۔ دس گھنٹے روزانہ کام کرتے ہیں۔ عدیم الفرصت اتنے کہ ایک لمحہ کی فراغت نہیں۔ اس قدر مصروف زندگی بسر کرنے پر بھی وہ تیس سال کی چھوٹی سی عمر میں آٹھ بچوں کے باپ ہیں۔ میرے

تخیل میں ہر رنگ اور ہر قسم کے ہندوستانی بچے گھومنے لگے۔ خاکروبوں کے بچے۔ میراسیوں کے بچے۔ کلرکوں کے بچے۔ ننگ دھڑنگ یتیم نیم مردہ۔ زرد رو۔ نہ جانے کیوں مجھے چند اعداد و شمار بے اختیار یاد آگئے "ہندوستان میں اوسطاً ایک منٹ میں دس بچے پیدا ہوتے ہیں۔ دنیا کے ہر پانچ آدمیوں میں ایک ہندوستانی ہے۔" اور بچوں کا تصور کرتے ہی مجھے وہ ٹڈی دل یاد آ گیا۔ جسے میں نے ایک کھیت کا دس منٹ میں صفایا کرتے دیکھا تھا۔ لیکن میں نے اس شوخ و شنگ یوروپین لڑکی کو نیچا دکھانے کا تہیہ کر لیا۔ "میڈم" میں نے کہا "ہم ہندوستانی ہر بات سوچ سمجھ کر کرتے ہیں۔ بچے پیدا کرنے کا مسئلہ ہی لیجئے۔ بلا شبہ یہ ہماری سب سے بڑی اور سب سے مرغوب دستکاری ہے۔ مگر یہ مت سمجھئے کہ ہم بغیر کسی مطلب کے بچے پیدا کئے جا رہے ہیں۔ دیکھئے آپ کے ملک میں کچھ تو ضبطِ تولید کے اصولوں پر سختی سے عمل کرنے کے سبب اور کچھ جنگ کی وجہ سے روز بروز مردوں کی تعداد گھٹ رہی ہے اگر یہ جنگ دس برس جاری رہی اور آپ ضبطِ تولید کے اتنے ہی پرجوش حامی جتنے اب ہیں تو ایک وقت ایسا آئیگا جب یوروپ میں بچوں اور مردوں کا قحط ہو جائیگا اُس وقت ہم ہندوستانی بچوں کی تجارت شروع کر دیں گے۔ اور جس طرح اب روئی اور جیوٹ کے جہاز انگلینڈ بھیجتے ہیں۔ اسی طرح بچوں کے جہاز انگلستان کی بندرگاہوں میں روانہ کریں گے۔ اس سے تین فائدے ہوں گے۔ ایک تو ہندوستان میں آبادی کا بڑھتا ہوا دباؤ کم ہو جائے گا۔ دوسرے ہندوستانی لوگ بچے فروخت کر کے بے اندازہ دولت سمیٹیں گے تیسرے انگلستان اور ہندوستان کے تعلقات مستحکم ہو جائیں گے۔

"کیوں کیسی رہی" میں نے ایک بلند قہقہہ لگایا۔ جیسے میں اس دلیل کے

بودے پن کا خود ہی مضحکہ اڑا رہا تھا۔

"دیکھو" اُس نے شرارت آمیز نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "فی الحال مجھے ہندوستانی بچے کی ضرورت نہیں" اور اُس نے اپنے کتے کو گود میں بٹھا لیا۔ "لیکن شاید مستقبل میں جب میں واپس لندن چلی جاؤں۔ تو مجھے ضرورت پڑ جائے۔ وعدہ کرو۔ کہ تم مجھے ایک ہندوستانی بچہ ارسال کر دوگے"

"ایک چھوڑ دس!"

"نہیں صرف ایک۔ مگر سنو۔ دو باتوں کا خیال رہے"

"آپ کا مطلب؟"

"پہلی بات یہ کہ وہ بچہ تمہارا نہ ہو"

"اور دوسری؟"

"دوسری یہ کہ اُس کا رنگ کالا نہ ہو!"

پیشتر اس کے کہ میں اُسے گالی دے سکتا۔ وہ باہر سڑک پر کھڑی اشارے سے تانگے والے کو بلا رہی تھی۔

ایک عام ہندوستانی کی ذہنیت اور سیرت

طہران سے ایک دوست نے پوچھ بھیجا ہے۔ کہ میں اُسے ایک عام ہندوستانی کی ذہنیت اور سیرت کے متعلق کچھ لکھوں۔ سوچتا ہوں۔ کیا لکھوں۔ ایک عام ہندوستانی ایک ترک کی نظر میں "شریف ترین غلام" ایک جرمن کے نزدیک "ذلیل ترین اپاہج" اور امریکن کی نظر میں "پُراسرار شعبدہ باز" ہے۔ دقیانوسی اور ضعیف الاعتقاد۔ انگریز اُسے جاہل اور نیم وحشی سمجھتے ہیں۔ اور اُن رحم دل چینی خواتین کی دانست میں جنہیں ہندوستان سے ہمدردی ہے۔ وہ روحانیت پرست اور سادہ لوح ہے۔ یہ تو ہوئی بیگانوں کی رائے۔ رہے یگانے۔ اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے۔ کہ اگر شاعرِ مشرق کے خیال میں وہ گرفتارِ طلسمِ ہیچ مقداری ہے۔ تو شاعرِ انقلاب کی نگاہ میں "بزدل اور مخنث" ہے۔

میری دانست میں کم و بیش یہ تمام تعریفیں مبالغہ آمیز ہیں۔ اور بعض تو سر بسر غلط مثلاً یہ کہنا کہ عام ہندوستانی بزدل ہے حقیقت کو جھٹلانا ہے۔ ہم ایک عام ہندوستانی پر سنگین سے سنگین الزام لگا سکتے ہیں مثلاً یہ کہ اُسے میانہ روی سے چڑ ہے۔ اس میں صبر اور ضبط کا فقدان ہے۔ اُسے مسکراہٹ سے زیادہ قہقہہ پسند ہے۔ وہ بانگے کے لباس۔ بانگے کی زبان" اور بانگے کے فیشن پہ جان چھڑکتا ہے۔ مگر یقیناً اُسے بزدل نہیں کہہ سکتے۔ پچھلے دنوں ہندو مسلم فسادات میں جس بہادری کے ساتھ ہندوؤں اور مسلمانوں نے ایک دوسرے کے سر پھوڑے تھے وہ اس امر پر دال ہے۔ کہ ہندوستانی شجاعت میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ اب رہا اُن کے مخنث ہونیکا معاملہ تو جس ملک کے باشندے دس سال کے قلیل عرصہ میں اپنی آبادی میں پانچ کروڑ افراد کا اضافہ کر سکتے ہیں۔ اُنہیں کوئی صحیح العقل مخنث کہنے کا حق نہیں رکھتا۔

میرا تو خیال ہے۔ کہ ذوق کے پیرِ مغاں کی طرح ہر ہندوستانی کے پاس وہ جادو ہے جس سے نامرد۔ مرد۔ اور مرد جوانمرد بن جاتا ہے۔ امریکنوں کا یہ کہنا کہ ہندوستانی شعبدہ باز ہے۔ اِس حد تک درست ہے کہ اُن کی واقفیت کا منبع اینگلو انڈین مصنفین کی وہ کتابیں ہیں۔ جن کے مطالعہ سے انسان یہی نتیجہ نکال سکتا ہے۔ کہ ہندوستان میں جادوگر بستے ہیں یا مہاراجے۔ اور رجعت پسند انگریز کا یہ نظریہ کہ عام ہندوستانی نیم وحشی ہے۔ اِس لئے غلط ہے کہ تازہ اعداد و شمار کے مطابق ہندوستان میں خواندہ اشخاص کی تعداد گیارہ فیصدی تک پہنچ گئی ہے۔ انگریز ہندوستانیوں کو سمجھنے میں اس لئے غلطی کرتا ہے کہ اُس کے خیال میں اُس کا بیرا (Bearer) ہندوستان کا بہترین نمائندہ ہے۔ اور امریکن اِس لئے کہ وہ اُن ہندوستانی یوگیوں اور فقیروں کو

ہندوستان کا مظہر سمجھ لیتا ہے۔ جو وقتاً فوقتاً اپنے شبدوں سے نیویارک اور شکاگو میں سنسنی پھیلاتے ہیں۔

تو پھر عام ہندوستانی کی ذہنیت کیا ہے۔ میری رائے میں عام ہندوستانی کی سیرت کو سمجھنے سے پہلے یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ عام ہندوستانی چاہے وہ دیہاتی ہے یا شہری، ہر حال میں خوش ہے۔ اگر اُسے سوراج مل جائے۔ جب بھی خوش اور اگر نہ ملے جب بھی خوش۔ بلکہ اگر نہ ملے تو زیادہ خوش! اگر اُسے نان جویں ملتی ہے جب بھی شاکر۔ من وسلویٰ ملے تب بھی قانع۔ دنیا اُس کی عزت کرتی ہے۔ تو شکر گذار اور اگر لوگ اُسے نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ تو ممنون۔ اُسے "نہ کرم کی خواہش ہے۔ نہ ستم کا شکوہ" ایک عام ہندوستانی اپنے تمام آلام ومصائب کا ذمہ دار صرف دو چیزوں کو ٹھہراتا ہے۔ یعنی انگریز اور قسمت۔ دو چیزیں اُس کے اعصاب پر ہر وقت سوار رہتی ہیں۔ مذہب اور عورت۔ دو چیزوں سے اُسے سخت نفرت ہے صفائی اور پابندی وقت سے دو چیزیں اُسے ازبس پسند ہیں۔ دخل درمعقولات اور شور۔

سب سے پہلی بات جو عام ہندوستانی کے متعلق کہی جا سکتی ہے۔ یہ ہے کہ وہ خدا اور روح کی ہستی کا قائل اور جراثیم کی ہستی کا منکر ہے۔ طبعًا وہ غلاظت پسند ہے۔ اُسے گندگی سے بہت کم گھن آتی ہے۔ اُس کے خیال میں بیماری یا وبا قہر آسمانی بنکر نازل ہوتی ہے۔ مکھیوں، مچھروں، ہیضہ اور تپ دق کے جراثیم کو سائنس دانوں نے مفت میں بدنام کر رکھا ہے۔ چنانچہ جہاں مکھی اور مچھر کو دیکھ کر ایک یوروپین کی روح فنا ہو جاتی ہے۔ وہاں ایک عام ہندوستانی نہایت اطمینان کے ساتھ وہ کھانے پھل

اور مٹھائیاں کھا سکتا ہے جن پر سارا دن مکھیاں بھنبھناتی رہتی ہیں۔

ایک عام ہندوستانی فطرتاً اور اصولاً آرام طلب اور سست الوجود واقع ہوا ہے۔ وہ جو شعر میرؔ نے اپنے متعلق محبت کے بارے میں کہا ہے۔ تھوڑی سی ترمیم کے بعد ہر ہندوستانی کے نظریہ حیات پر صادق آتا ہے۔ ؎

ہوگا کسی دیوار کے سائے میں پڑا میرؔ
کیا کام مشقت سے اُس آرام طلب کو

تضیع اوقات ہر ہندوستانی کا پسندیدہ شغل ہے۔ اکثر حالتوں میں پسندیدہ پیشہ بھی۔ اور جب وہ وقت ضائع کرنے پر آتا ہے۔ تو بخل سے کام نہیں لیتا۔ گپیں ہانکنے میں اُس کا کوئی ثانی نہیں چینی بھی اُس کے آگے پانی بھرتا ہے۔ میرے خیال میں ہندوستان میں جتنے گپ بازپائے جاتے ہیں۔ شاید ہی دنیا کے کسی اور حصے میں ملیں اور کبھی تو میں سوچتا ہوں کہ ہندوستانی سوراج بھی اسی لئے نہیں لینا چاہتا۔ کہ وہ ہوم رول کو محض دردِ سر سمجھتا ہے۔ وہ حاکم بننے سے اِس لئے کتراتا ہے۔ کہ اُسے گپیں ہانکنے کے شغل سے محروم ہونا پڑے گا۔ فی الواقعہ وہ یہ چاہتا ہے۔ کہ ہمیشہ کسی دوسری قوم کے ماتحت رہے۔ ایسی قوم جو اُس کی طرح سست الوجود نہ ہو۔ اور جو اُس کے ملک کا انتظام کر سکے۔

ایک عام ہندوستانی کا عورت کے متعلق جو نظریہ ہے۔ وہ بھی اُس کی ذہنیت پر کافی روشنی ڈالتا ہے۔ اگر ذرا دریدہ دہنی سے کام لیا جائے۔ تو تسلیم کرنا پڑیگا کہ حسن پرستی ہر ہندوستانی کے خمیر میں ہے۔ اُس کے خیال میں عورت پیدا ہی اِسلئے

کی گئی ہے۔ کہ مرد کے جذبۂ شہوت کی تسکین کرے۔ نیز مرد اس لئے پیدا ہوا ہے کہ
زیادہ سے زیادہ عورتوں کو اپنی ہوس کا نشانہ بنائے چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جب
کبھی ہندوستانی کے پاس ضرورت سے زیادہ روپیہ ہو جاتا ہے۔ تو اُسے یہ فکر
دامنگیر ہوتی ہے کہ کہیں سے خوبصورت عورتیں حاصل کرنے کا انتظام کرے۔ ایک عام
ہندوستانی جب جنت کا تصور کرتا ہے۔ تو سب سے پہلے اُس کے ذہن میں حرم کا تصور
آتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر جنت سے حوریں نکال دی جائیں۔ تو کوئی ہندوستانی
جنت میں جانے کے لئے تیار نہ ہوگا۔ برعکس اس کے اگر تمام حوروں کو دوزخ میں منتقل
کر دیا جائے۔ تو ہر ہندوستانی دوزخ میں داخل ہونے کے لئے بیتاب نظر آئیگا۔ بچپن
اور اوائل عمر میں ایک عام ہندوستانی کو عورت کے قرب سے اس بیدردی سے
محروم کیا جاتا ہے۔ کہ جنسی طور پر وہ ساری عمر تشنہ کام رہتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے
کہ وہ سڑک پر چلتے وقت عورتوں کو گھور گھور کر دیکھتا ہے۔ اور خوبصورت عورت کو جاتے دیکھ کر
مچل جاتا ہے۔ اور چلتے چلتے اس کوشش میں رہتا ہے۔ کہ کسی خوبصورت عورت کے
ساتھ اُس کا شانہ چھو جائے۔ ہندوستان میں تقریباً پچاس فیصدی یا پچھتر فیصدی
لوگ جنسی تشنگی کا شکار ہیں لیکن اگر غور کیا جائے۔ تو یہ تشنگی ہندوستانیوں کے
حق میں رحمت ثابت ہوئی ہے کیونکہ ہندوستان ہی ایسا ملک ہے جہاں تقریباً
ہر شادی کامیاب شادی کہی جا سکتی ہے۔ یہ جنسی تشنگی کی ہی برکت ہے کہ ہندوستانی
خاوند پھوہڑ سے پھوہڑ اور بدصورت سے بدصورت بیوی کے ساتھ مطمئن رہتا ہے
امریکہ اور انگلینڈ میں خاوند اس لئے بیوی کو طلاق دینے پر آمادہ ہو جاتا ہے کہ وہ سوتے
وقت زور سے خراٹے لیتی ہے۔ وہاں ہندوستانی خاوند بیوی کے بڑے سے بڑے

فنتس کو اس لئے نظرانداز کر دیتا ہے کہ اُسے بڑی بڑی شکلوں کے بعد ملی ہے۔

تقریباً ہر ہندوستانی مذہب کے نام پر بیوقوف بنایا جا سکتا ہے۔ مذہب پر تو وہ پکا ہوا ہے۔ وہ اپنے مذہب سے اس لئے محبت نہیں کرتا۔ کہ یہ اُسے خدا کے قریب لاتا ہے۔ بلکہ اس لئے کہ یہ اُسے اپنے ہم وطنوں سے دُور لے جاتا ہے۔ ہر ہندوستانی کو ایک "خدا" چاہیئے۔ پرستش کے لئے نہیں۔ بلکہ اپنے ہمسائے سے لڑنے کے لئے۔ ہندوستان مذاہب کا گھر ہی نہیں بلکہ کارخانہ ہے۔ یہاں گلی گلی اور کوچہ کوچہ میں پیغمبر اور اوتار پیدا ہوتے ہیں۔ یہاں ہر ایک آدمی متقی اور خدا پرست ہے جسے خدا سے محبت اور خدا کے بندوں سے نفرت ہے۔ یہ ان مذاہب کا ہی احسان ہے کہ مختلف اقوام کے درمیان ناقابلِ عبور خلیجیں بن گئی ہیں۔ چنانچہ جب تک یہ خلیجیں موجود ہیں۔ کسی انگریز کو مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔

ایک عام ہندوستانی نجات یا مُکتی کا اس قدر دلدادہ ہے کہ وہ اسے حاصل کرنے کے لئے ہر قسم کی زحمت برداشت کر سکتا ہے۔ وہ اولیائے کرام کے مزاروں پر جا کر گڑگڑاتا ہے۔ تیرتھ یاترا یا حج کر کے پھُولے نہیں سماتا۔ مگر باوجود ان باتوں کے وہ یقیناً روحانیت پرست نہیں۔ وہ چاندی کے ٹکڑوں کے لئے آپس میں لڑتا ہے اور روپے کی خاطر اپنی روح کو بیچنے کے لئے آمادہ ہے۔

ایک عام ہندوستانی کے لئے سب سے کڑی سزا غریب الوطنی ہے۔ سب سے بڑی مصیبت نا کتخدا رہنا۔ سب سے بڑی خوشی۔ لڑکے کی پیدائش۔ سب سے بڑی عیاشی چھپ کر شراب پینا۔ سب سے بڑی سعادت حاکمِ وقت کی خوشامد۔ اور سب سے بڑا گناہ

حب الوطنی ہے۔ ایک عام ہندوستانی کو مستقبل سے زیادہ ماضی سے محبت ہے۔ سیاست سے زیادہ مذہب عزیز ہے۔

...... خط طویل ہوتا جارہا ہے۔ اور ابھی میں نے کچھ بھی تو نہیں لکھا یعنی جو کچھ لکھا ہے ڈر ڈر کر لکھا ہے۔ تو کیا جو کچھ مجھے ایک عام ہندوستانی کی ذہنیت کے متعلق معلوم ہے۔ صاف صاف لکھ دوں ..... بھڑوں کے چھتے کو چھیڑنے سے فائدہ؟ اور پھر لوگ کیا کہیں گے۔ لوگ کیا کہیں گے! آہ۔ ہر ہندوستانی کا ابدی ہوا۔ لوگ کیا کہیں گے۔

اور پھر اگر شامتِ اعمال سے یہ خط برٹش پارلیمنٹ کے ہتھے چڑھ جائے۔ تو کیا وہ اِس تحریر کی بنا پر اصلاحات کی تازہ قسط نہ روک لے گی؟ نہیں نہیں میں یہ خط کبھی مکمل نہیں کرونگا..... کولریج کے شاہکار "قبلا خاں" کی طرح یہ خط ہمیشہ نامکمل رہے گا ——

شیشہ و تیشہ

(مضامینِ طنز و مزاح)

کنہیا لال کپور

حالی ترقی پسند ادیبوں کی محفل میں

افراد

خواجہ الطاف حسین حالی	طویل لکھنوی
باغی غارت آبادی	جہاد دہلوی
مبہم الہ آبادی	بجھکڑ مرشد آبادی
انقلاب جہاں آبادی	چند شعرا

ایک شاعر: حضرات! ہماری خوش قسمتی ہے۔ کہ اُردو زبان کے سب سے پہلے اور سب سے بڑے ترقی پسند شاعر خواجہ الطاف حسین صاحب حالی ہمارے درمیان موجود ہیں جیسا کہ آپ جانتے ہیں۔ خواجہ فردوس بریں سے صرف

چند لمحوں کے لئے ہماری بزم کی رونق بڑھانے کے لئے تشریف لائے ہیں میں نہایت ادب کے ساتھ اُن سے درخواست کرتا ہوں۔ کہ وہ اِس محفل کی صدارت قبول فرمائیں۔

حالی:۔ حضرات! اِس کرم فرمائی کا بہت بہت شکریہ۔ مگر مجھے ترقی پسند شاعر کی ترکیب کچھ زیادہ پسند نہیں۔ مجھے صرف شاعر ہی رہنے دیا جائے۔

ایک اور شاعر:۔ مولانا! ترقی پسند شاعر کی ترکیب پر آپ کو کیا اعتراض ہے؟

حالی:۔ ناراض نہ ہوں۔ مجھے یہ ترکیب کچھ ذومعنی سی معلوم ہوتی ہے میں ہمیشہ اس کا مطلب یوں لیتا ہوں۔ کہ ترقی پسند شاعر وہ ہے۔ جو اُردو شاعری کی بجائے اپنی ترقی چاہتا ہے۔

(قہقہہ)

وہی شاعر:۔ واللہ آپ نے مطلب خوب پیدا کیا۔

حالی:۔ محفل کی کارروائی شروع کرنے سے پہلے میں سیکرٹری صاحب کی طرف سے یہ اعلان کرنا چاہتا ہوں۔ کہ یہ ترقی پسند شعرا کا پہلا مشاعرہ ہے اس لئے اس میں شریک ہونے والے شعرا مندرجہ ذیل شرائط کو مدنظر رکھیں۔

۱۔ مصرع کی طوالت پر کوئی قید نہ ہوگی

۲۔ ایسی کوئی نظم نہ پڑھی جائے جس کا مفہوم صرف ایک بار پڑھنے سے سمجھ میں آجائے۔

حضرات! کیا آپ کو یہ شرائط منظور ہیں۔

تمام شعرا:۔ (بیک زبان) ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔

حالی:۔ تو سب سے پہلے میں جناب طویل لکھنوی سے درخواست کرتا ہوں۔ کہ اپنی نظم پڑھیں۔

طویل لکھنوی:۔ نظم کا عنوان ہے "پرواز" عرض کیا ہے۔ ؎

مرا تخیل پہنچ گیا ہے زمیں سے اک جست میں وہاں تک کہ جس جگہ کہکشاں نے دھندلی سی رہگذر پر بچھا دیئے ہیں ہزاروں موتی کہ جیسے شبنم کے لاکھوں قطرے چمک رہے ہوں ہزاروں پھولوں کی پتیوں پر سحر سے پہلے۔

حالی:۔ یہ مصرع ہے یا شیطان کی آنت!

طویل لکھنوی:۔ مولانا یہی تو اس صنف کی خوبی ہے۔ دیکھئے نا۔ اس میں انڈیا ربڑ (India Rubber) کی سی لچک ہے۔ مصرع جتنا لمبا چاہو۔ کھینچ کر بنا لو۔ اور اگر آپ کو مصرع کی طوالت پر واقعی اعتراض ہے۔ تو دوسرا مصرع چھوٹا کر دیتا ہوں۔

حالی:۔ مگر آپ پہلے مصرع کو بھی دو تین چھوٹے مصرعوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

طویل لکھنوی:۔ دیکھئے نا مولانا۔ یہ مصرع بالکل اسی طرح میرے ذہن میں آیا ہے اور اسے چھوٹے چھوٹے مصرعوں میں تقسیم کر کے میں خیالات کے تسلسل کو توڑنا نہیں چاہتا۔

حالی:۔ مگر یہ مصرع پڑھتے پڑھتے تو قاری کا سانس پھول جاتا ہے۔

طویل لکھنوی:۔ دم بے شک پھول جاتا ہے مگر ساتھ ہی پھیپھڑوں کی ورزش بھی ہو جاتی ہے۔

حالی:۔ تو یہ شاعری کی شاعری ہے۔ ورزش کی ورزش!

ایک شاعر:۔ آپ ہی نے تو مقدمہ شعر و شاعری میں فرمایا ہے۔ کہ غزل مسلسل خیالات کو بیان کرنے سے قاصر ہے۔ ردیف اور قافیہ کی پابندی سے شاعر اپنے مطلب کو آزادی کے ساتھ ظاہر نہیں کر سکتا۔

حالی:۔ لیکن میرا مطلب یہ تھا کہ شاعر ساری نظم کو ایک ہی مصرع میں ختم کر دے۔

طویل لکھنوی:۔ میں نے ساری نظم ایک مصرع میں تو ختم نہیں کی۔ یہ تو ابھی ابتدائیہ ہے جسے آپ روایتی شاعری میں کہیں گے 'مطلع'

حالی:۔ اچھا تو ابھی نظم باقی ہے۔ ارشاد۔

طویل لکھنوی:۔ میں اُڑ رہا ہوں ہواہیں ایسے
کہ جس طرح چیل یا کبوتر
نہیں نہیں جس طرح کہ شاہیں
نہیں تو جس طرح کوئی تیتر۔ ہواہیں اُڑ کر زمیں پہ اُترے
کہ جنگ میں جیسے طرح سپاہی۔ اُتر رہا پیراشوٹ سے ہو۔
اسی طرح یہ مرا تخیل پہنچ گیا ہے۔ زمیں سے اک جست میں
وہاں تک کہ جس جگہ کہکشاں نے دھندلی سی رہگزر پر ....

حالی:۔ (بات کاٹ کر) اگر آپ مطلع دہرانے لگے ہیں تو بے شک آگے نہ پڑھیئے۔ یہ ہم سن چکے ہیں۔

طویل لکھنوی:۔ بہت پسند آئی آپ کو نظم؟

حالی:۔ ایمان کی یہ ہے۔ کہ آپ اتنی بلندی پر پرواز کر رہے ہیں۔ کہ میرا ناقص تخیل وہاں پہنچنے سے یکسر قاصر ہے۔

طویل لکھنوی : خیر مولانا یہ تو کسر نفسی ہے۔ ورنہ کیا یہ ممکن ہے کہ آپ جیسا ترقی پسند شاعر اس نظم کو نہ سمجھ سکے۔

حالی : اگر میں اس کا مفہوم سمجھ سکتا۔ تو شاید یہ ترقی پسند نظم نہ رہتی۔

ایک شاعر : تو آپ کا مطلب ہے۔ کہ ترقی پسند شعرا غالب کی طرح دقت پسند واقع ہوئے ہیں۔

حالی : ہاں۔ مگر غالب کی دقت پسندی اور ترقی پسند شعرا کی دقت پسندی میں ایک بہت بڑا فرق ہے۔

وہی شاعر : یعنی ؟

حالی : یعنی یہ کہ غالب دقت پسند ضرور ہیں۔ مگر بے معنی اشعار نہیں لکھتے۔ اور ترقی پسند شعرا...... خیر میں اُن کا ذکر نہیں کرونگا۔

وہی شاعر : مولانا۔ یہ زیادتی ہے۔

حالی : خیر۔ اس بحث کو طول دینے سے فائدہ ؟ اب جناب باغی غارت آبادی سے درخواست کی جاتی ہے۔ کہ وہ اپنی نظم پڑھیں۔

باغی غارت آبادی : حضرات ! نظم کا عنوان ہے "خُون" عرض کرتا ہوں

لکھنؤ میں خون۔ کلکتے میں، لدھیانے میں خون

بمبئی میں خون۔ امرتسر میں، ہریانے میں خون

مسجدوں میں خون۔ سینما گھر میں، میخانے میں خون

ہوٹلوں میں خون۔ چڑیا گھر میں، تھانے میں خون

باغ میں خون۔ وادیوں میں خون۔ ویرانے میں خون

ساغروں میں خون۔ خم میں خون پیمانے میں خون

خون برسا آسماں سے خوں کے اُٹھے حباب

مژدہ اے مزدور آیا پھر جہاں میں انقلاب

گھر میں خون۔ بازار میں خون اور شفاخانے میں خون

وزیروں میں خون۔ مندروں میں خون.........

حالی:۔ قطع کلام معاف۔ باغی صاحب۔ مگر آخر اس قدر خونی نظم لکھنے کی ضرورت؟

باغی غارت آبادی۔ مولانا۔ یہ انقلابی نظم ہے۔ اس میں خون کا ذکر اتنا ضروری ہے جتنا روایتی شاعری میں شراب کا۔

ایک شاعر:۔ میرا خیال ہے۔ آپ ہی نے تو فرمایا تھا۔ کہ شاعری میں جوش کا عنصر اشد ضروری ہے۔

حالی:۔ مگر آپ کو اتنی خونریزی کی ضرورت نہ تھی۔ میں تو کہوں گا۔ کہ اگر آپ خون کا عنصر کم کر دیں تو شاید نظم بہتر ہو جائے۔

باغی غارت آبادی:۔ شاید۔ مگر نظم میں جوش نہیں رہے گا۔

حالی:۔ میری دانست میں یہ جوش غلط قسم کا ہے۔

جہاد دہلوی:۔ مولانا۔ اس نظم کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔

حالی:۔ ارشاد۔ جہاد صاحب۔

جہاد دہلوی سے جی میں آتا ہے کہ اُٹھ کر آج ساغر توڑ دوں

مار کر پتھر پہ خنجر اپنا خنجر توڑ دوں

توڑنے سے پہلے کشتی اُس کا لنگر توڑ دوں

اپنا سر پھوڑدوں نہ پھوڑوں غیر کا سر پھوڑدوں
وائے حسرت کیا کروں۔ اُف ہائے حسرت کیا کروں

باقی شعرا:۔ سبحان اللہ۔ یہ نظم کیا ہے۔ وہ آتش ہے۔

جہاد دہلوی:۔ آداب عرض دوسرا بند عرض کرتا ہوں۔

جی میں آتا ہے کہ اُٹھ کر آشیاں کو پھونکدوں
پھونکدوں یہ چاند تارے۔ آسماں کو پھونکدوں
پھونکدوں کشتی کو اپنے بادبان کو پھونکدوں
مہرباں کو پھونکدوں نامہرباں کو پھونکدوں
وائے حسرت کیا کروں۔ اُف ہائے حسرت کیا کروں۔

حالی:۔ (ہنس کر) یک نہ شُد دو شُد۔ آپ نے تو باغی صاحب کو بھی مات کردیا۔ آخر آپ ہر ایک چیز کو توڑنے اور پھونکنے پر کیوں تُلے ہوئے ہیں۔

جہاد دہلوی:۔ مولانا۔ اس کے بغیر چارہ ہی کیا ہے ؟

حالی:۔ تو آپ تعمیر کی بجائے تخریب کے زیادہ دلدادہ ہیں۔

جہاد دہلوی:۔ جب تک تخریب نہ ہوگی۔ تعمیر ناممکن ہے۔

حالی:۔ بے شک۔ مگر آپ نے تعمیر کے متعلق تو کچھ ارشاد نہیں فرمایا۔

جہاد دہلوی:۔ وہ اس لئے کہ یہ تخریب کا دَور ہے۔

حالی:۔ یہ محلِ نظر ہے۔ خیر اب مبہم الہ آبادی کا کلام سنئے۔

مبہم الہ آبادی:۔ لے رہی ہے دماغ میں چکر۔
جیسے راہی بھٹک کے منزل سے

جیسے کشتی بھنور کے دامن میں
میرا مطلب ہے بند کمرے میں
کوئی شپّر کہ روشنی میں جو۔
دیکھ سکتی نہیں ہے راہ اپنی۔
جیسے اپنی بھٹک کے منزل سے
کوئی راہی غریب بے چارہ
ہے لگاتا اِدھر اُدھر چکر۔
جیسے کشتی بھنور کے چنگل میں۔
پی کے قہوہ بہک گیا ہوں میں۔
کیسا کڑوا مزہ ہے قہوے کا۔
بات سیدھی سی کہنا چاہتا ہوں۔
لے رہی ہے دماغ میں چکر۔
آ ہی جائے گی ایک دن لب پر۔

حالی:- آپ نے تو ابہام کو معراج تک پہنچا دیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ آپ کہنا کیا چاہتے ہیں۔

مبہم الہ آبادی:- گستاخی معاف۔ مولانا۔ ابہام ہی تو نئی شاعری کی جان ہے

حالی:- یعنی آپ کے خیال میں نظم کو ایک اچھا خاصہ معمہ ہونا چاہیئے۔ وہی بات ہوئی نہ کہ سہیلی بوجھ پہیلی۔

بجھکڑ مرشد آبادی:- مولانا۔ یہ بات آپ میری اس نظم میں پائیں گے۔ عنوان

ہے "کون"۔ اور نکتہ اس میں یہ ہے کہ آپ اس "کون" کے معمے کو تب تک حل نہیں کر سکیں گے۔ جب تک میں آپ کی مدد نہ کروں۔

حالی:۔ ارشاد۔ بجھکڑ صاحب۔

بجھکڑ مرشد آبادی:۔ عرض کیا ہے۔

روزنِ در سے جھانک کر مجھ کو
کس لئے روز لوٹ جاتی ہے
تیری آنکھیں ہیں جیسے انگارے۔
تیری مونچھیں پسند ہیں مجھ کو۔
دیکھ لیتی ہے روزنِ در سے۔
لیکن اندر قدم نہیں رکھتی۔
کس لئے مجھ سے اتنا ڈرتی ہے۔
کیوں کنکھیوں سے دیکھ لیتی ہے۔
میری آغوش میں نہیں آتی۔
کس قدر شوخ ہے ارے توبہ۔

(یک لخت رک کر) بھلا بتایئے۔ وہ کون ہے؟

حالی:۔ (بے بسی ظاہر کرتے ہوئے) بھئی ہماری سمجھ میں تو کوئی مونچھوں والی ہمسائی!

بجھکڑ مرشد آبادی:۔ (قہقہہ لگا کر) بخدا۔ آپ غلط سمجھے۔ لیجئے میں راز انکشاف کئے دیتا ہوں۔

کس قدر شوخ ہے ارے توبہ۔
آپ سمجھے کہ میری محبوبہ!
میرا مطلب مگر ہے بلی سے۔
جو کہ ہر روز روزن در سے۔
دیکھ لیتی ہے۔لوٹ جاتی ہے۔
اور اندر قدم نہیں رکھتی۔

چند شعرا:- بھئی کمال کا نکتہ ہے۔ بھکڑ صاحب ایہام کے تو آپ بادشاہ ہیں

حالی:- اب آخر میں جناب انقلاب جہاں آبادی اپنی نظم پڑھیں گے۔

انقلاب جہاں آبادی:- میری نظم خالصتاً ترقی پسند ہے۔عنوان ہے
" بھولی بھکارن "

حالی:- ارشاد۔

انقلاب جہاں آبادی:- عرض کیا ہے۔

کوٹتی ہے روز پتھر تو سڑک پر بیٹھ کر۔
دیکھ کر حالت تری مجھ کو نہ آئے رحم کیوں
وائے قسمت۔ یہ حنائی انگلیاں
کالی کالی تیری باہیں تمتماتے سخت گال۔
منہ میں میرے پانی بھر آیا تھا جن کو دیکھ کر
ہائے اِن ہاتھوں سے پتھر کوٹ کر۔
کر رہی ہے حسن کی توہین کیوں۔

ساتھ چل میرے۔ نہ شرما۔ میرے کاشانے میں چل
دیکھ وہ اُٹھی ہے مغرب سے گھٹا۔
بادلوں کی گھن گرج سے کانپ اُٹھا آسمان
کیا کرے گی ایسے موسم میں تو پتھر کوٹ کر۔
کیا ترے ہاتھوں کی مہندی تو اُتر نہ جائیگی
ساتھ چل میرے نہ شرما۔ میرے کاشانے میں چل
دیکھ مجھ کو کتنی ہمدردی ہے تری ذات سے۔

حالی:۔ انقلاب صاحب۔ کیا میں پوچھنے کی جرأت کر سکتا ہوں۔ کہ اس نظم میں ترقی پسندی کا کونسا عنصر ہے۔

انقلاب جہاں آبادی:۔ عنصر؟ ساری کی ساری نظم ہی ترقی پسند ہے۔

حالی:۔ اِس لئے کہ آپ نے روایتی محبوب کی بجائے بھکارن سے اظہارِ عشق کیا ہے۔

انقلاب جہاں آبادی:۔ یہ اظہارِ عشق نہیں۔ اظہارِ ہمدردی ہے۔

حالی:۔ آپ بے شک اِسے ہمدردی کہیں۔ مگر میں تو یہ کہوں گا۔ کہ آپ نے بیچاری بھکارن کو بہکانے کی کوشش کی ہے۔

ایک شاعر:۔ یہ اس لئے کہ شاعر حساس واقع ہوا ہے۔ وہ جب خوبصورت بھکارن کو پتھر کوٹتے ہوئے دیکھتا ہے۔ تو کلیجہ مسوس کر رہ جاتا ہے۔

حالی:۔ نہ صرف کلیجہ مسوس کر بلکہ کلیجہ پکڑ کر بھی۔ اور شاید یہ اسلئے کہ شاعر کنوارا ہے۔

وہی شاعر:۔ مولانا۔ آپ تو بہت دُور چلے گئے۔

حالی:- اچھا صاحب تو اب پروگرام ختم ہے۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔ میں اب آپ سے رخصت چاہتا ہوں۔ پھر ملیں گے اگر.....

ایک شاعر:- (بات کاٹ کر) ٹھہریئے۔ مولانا ابھی جانے کی کیا جلدی ہے ہم کچھ سنے بغیر نہ جانے دیں گے۔ اور پھر آپ نے ابھی تک کوئی پیغام بھی تو نہیں دیا۔

حالی:- معاف کیجئے گا۔ میں عجیب تذبذب میں ہوں۔ گویم مشکل وگر نگویم مشکل میں نے جو کچھ کہنا تھا۔ مقدمہ شعر و شاعری میں کہہ چکا۔ باقی رہی ترقی پسند شاعری۔ حضرات جب میں ترقی پسند شاعری کے متعلق بہت مایوس ہوتا ہوں۔ تو اپنا ایک پرانا شعر دُہرا لیتا ہوں۔ ؎

سخن پر ہمیں اپنے رونا پڑے گا
یہ دفتر کسی دن ڈبونا پڑے گا

مگر یہ مایوسی کے لمحے دیرپا نہیں ہوتے۔ مجھے ترقی پسند شعراء سے بہت توقعات ہیں۔ مجھے اُن کی بہت سی جدتوں سے اتفاق ہے۔ مگر چونکہ طبعاً واعظ و خطیب واقع ہوا ہوں، اسلئے یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کہ ترقی پسند شعرا نظمیں لکھتے وقت "اچھے شعر کی تعریف" مدنظر رکھیں جو میں نے اس طرح کی ہے۔

اے شعر دلفریب نہ ہو تُو تو غم نہیں
پر تجھ پہ حیف ہے۔ جو نہ ہو دلگداز تُو
صنعت پہ ہو فریفتہ عالم اگر تمام
ہاں سادگی سے آئیو اپنی نہ باز تُو

ایک شاعر:- مولانا۔ آپ کا مشورہ ہے تو کچھ ٹیڑھا سا۔ لیکن حتے الامکان اس

پر عمل کرنے کی کوشش کریں گے۔

حالی: شکریہ۔ بہت بہت شکریہ حضرات میں آپ سب کا ایک دفعہ پھر شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ میں واقعی بہت لطف اندوز ہوا ہوں۔ جنت میں ایسی محفلیں کہاں۔ میرا مطلب ہے۔ جنت میں ہم سب رجعت پسند اکٹھے ہو گئے ہیں۔ آپ یقین رکھئے۔ میں جب فردوس میں واپس جاؤں گا۔ تو میر غالب اور اقبال کو مجھ سے یہ سُنکر خوشی ہو گی۔ کہ اُردو شاعری ترقی کر رہی ہے.....خوب ترقی کر رہی ہے.......خدا حافظ۔

(بہ اجازت آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ)

شیشہ و تیشہ

(مضامینِ طنز و مزاح)

کنہیا لال کپور

افسانے کا پلاٹ

میرے دوست جناب عاشق حسین بٹالوی نے ایک دن برسبیل تذکرہ فرمایا۔ کہ ہندوستانی زندگی میں ایک اچھے افسانہ کے لئے پلاٹ کا ملنا ناممکنات میں سے نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ پہلے پہل تو میں نے اُن کے اِس نظریہ کو تجاہلِ عارفانہ پر محمول کیا۔ میں نے سوچا یہ کس طرح ممکن ہے۔ اگر واقعی ہماری زندگی اتنی غیر دلچسپ ہے کہ اُس میں سے اچھے افسانہ کے لئے پلاٹ نہیں مل سکتا۔ تو یہ "پریم پچیسیاں" اور "پریم بتیسیاں" کس طرح معرضِ وجود میں لائی جاتی ہیں۔ اور خود عاشق صاحب نے "سوزِ ناتمام" اور "رہگذر" کی تخلیق کس طرح کی۔ اور یہ جو میرے چند احباب آئے دن رسائل میں افسانے شائع کراتے ہیں۔ یہ کہاں سے پلاٹ حاصل کرتے ہیں۔ مگر جب میں نے اس نظریہ پر مزید غور کیا۔ تو معلوم ہوا کہ اِس میں

بہت حد تک صداقت ہے۔ چنانچہ جس وقت میں نے چند "بسیار نویس" افسانہ نگاروں کے افسانوں کا تجزیہ کیا۔ تو مجھ پر یہ راز کھلا۔ کہ اُن کے بہت سے افسانوں کا پلاٹ ایک ہی ہے۔ نہ صرف پلاٹ ہی۔ بلکہ پس منظر بھی۔ مثال کے طور پر مجھے پتہ چلا کہ تین معروف افسانہ نویسوں کے متعدد افسانوں کا پسِ منظر بالترتیب "کشمیر"۔ "متوسط مسلم گھرانا" اور "بازارِ حسن" ہے۔ اور جہاں تک پلاٹ کا تعلق ہے۔ ایک ہی قسم کے واقعات معمولی تصرف کے ساتھ ہر ایک افسانہ میں دہرائے گئے ہیں یعنی پلاٹ کا اتنی بار اعادہ کیا گیا ہے۔ کہ وہ الجبرا کا فارمولا بن کر رہ گیا ہے چنانچہ اگر ہم چاہیں تو ان تینوں افسانہ نگاروں کے پلاٹ الجبرے کی اصطلاح میں یوں بیان کر سکتے ہیں:

(۱) الف کشمیر جاتا ہے۔ وہاں اُسے ب سے محبت ہو جاتی ہے ج اُن دونوں کی راہ میں حائل ہوتا ہے۔ الف مایوس ہو کر گھر آجاتا ہے۔

اس فارمولا میں الف = نوجوان طالب علم۔

ب = خوبصورت کشمیری لڑکی

ج = سماج کے قوانین۔ ذات پات۔ لڑکی کے والدین۔ لڑکی کا پہلا عاشق۔

(۲) الف کو ب سے محبت ہو جاتی ہے۔ ب کے والدین اُس کا عقد ج سے کر دیتے ہیں۔ آخر میں ب کی شادی الف یا ج سے ہو جاتی ہے۔

اِس فارمولا میں الف = نوجوان مسلمان طالب علم

ب = الف کی چچا، چچی۔ اسی یا پھوپھی کی لڑکی۔

ج = الف کا چچا زاد یا ماموں زاد بھائی۔

(۳) الف، ب کے پاس جاتا ہے۔ اُسے ب سے محبت کرنے کے بعد بعض دفعہ نفرت اور اکثر حالتوں میں ہمدردی ہو جاتی ہے۔

الف = جنسی فاقہ کشی سے تنگ آیا ہُوا نوجوان

ب = طوائف

افسانہ نگار نمبرا اور نمبر۲ کے افسانوں میں سب سے نمایاں فرق یہ ہے۔ کہ اول الذکر ناکام اور ناکامیاب عشاق کی داستان دہراتا ہے۔ اور مؤخر الذکر کامیاب اور شادکام عشاق کی۔ اور یہ سب اسلئے کہ ہندوستانی زندگی میں افسانے کے لئے پلاٹ نہیں ملتا۔

اب عاشق صاحب کا یہ کلیہ مجھے ایسی تلخ حقیقت نظر آتا ہے جس کی صداقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ کلیہ جہاں ہندوستانی افسانہ نگاروں کی بدنصیبی پر دلالت کرتا ہے۔ وہاں ہماری طرزِ معاشرت پر بھی گہری چوٹ ہے۔ خود میں پندرہ سال سے اپنے خاندان اور اپنے احباب کے خاندانوں سے اُمید لگائے بیٹھا ہوں کہ اُن میں کوئی رومانی واقعہ رونما ہو۔ جس پر افسانہ لکھوں۔ لیکن مجھے افسوس کے ساتھ اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ کہ آج تک مجھے ایک اچھے افسانہ کے لئے پلاٹ دستیاب نہیں ہوسکا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اِن تمام خاندانوں میں کوئی حادثہ یا سانحہ ہوا ہی نہیں۔ واقعات تو کئی ظہور پذیر ہوئے۔ مگر اُن میں ایک پلاٹ کی سی باقاعدگی نہ تھی۔ کسی کا عروج (Climax) غائب تھا۔ تو کسی کی پیچیدگیاں (Complications)۔ اب آپ ہی بتائیے۔ ایسے بے ہنگم واقعات کو کیا کیا جائے۔ شاید اسی لیے میرے دوست قلندر پاریکھ فرماتے ہیں۔ کہ وہ افسانہ میں واقعات کے باقاعدہ تسلسل کو پسند نہیں کرتے۔ اُن کے خیال میں افسانہ نویس کو

ایسے برساتی ٹڈے کی طرح ہونا چاہیئے۔ جو ایک واقعہ سے اُڑکر دوسرے پر جا بیٹھے۔ اور دوسرے سے تیسرے پر۔ حتیٰ کہ کاغذ ختم ہو جائے۔ چنانچہ پرمارتھی صاحب کے متعدد افسانے اِس ٹیکنیک کی بہترین مثالیں ہیں۔

اب پچھلے چند دنوں سے افسانہ نگاروں نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ ہندوستانی زندگی میں اچھے پلاٹ کا فقدان ہے۔ ایک نئی روش اختیار کی ہے۔ وہ یہ کہ ایک دوسرے پر افسانے لکھے جائیں۔ یہ" ادبی مردم خوری" اُن کی بہت سی مشکلوں کو آسان کر دے گی۔ کیونکہ ایسے افسانے حقیقت نگاری کے معجزے ہونے کے علاوہ سیرت نگاری کے شاہکار بھی ہوں گے۔

اچھے پلاٹ کا نہ ملنا ہی شاید اِس امر کا ذمہ دار ہے کہ جب کوئی نیا موضوع یا کردار افسانہ نویسوں کے ہاتھ لگتا ہے تو اس کا اچھی طرح کچومر نکال لیتے ہیں۔ پچھلے پانچ سال میں بیچارے مزدور کی جو گت بنائی گئی ہے۔ وہ کسی سے پوشیدہ نہیں اب مزدور کو اپنے حال پر چھوڑ کر افسانہ نویس طوائف کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں چنانچہ آپ اب تقریباً ہر رسالہ میں ایک آدھ افسانہ طوائف پر ضرور پڑھیں گے۔ اور بعض معیاری رسائل تو صرف وہی افسانے منتخب کرتے ہیں۔ جو طوائف کے گرد گھومتے ہیں۔

میرے ایک دوست نے اِس مشکل کا ایک اور حل نکالا ہے۔ وہ یہ کہ ایک ہی پلاٹ کو مختلف اصناف ادب پر آزمایا جائے۔ مثلاً پہلے اُس پر افسانہ لکھا جائے چند دنوں کے بعد ڈرامہ۔ کچھ اور عرصہ کے بعد مثنوی۔ اور چند مہینوں کے بعد ناول! میری دانست میں ہندوستانی زندگی میں یہ نقص نہیں۔ کہ اِس میں واقعات

نہیں ہوتے۔ بلکہ یہ کہ اُن واقعات کا کوئی کلائی میکس (Climax) نہیں ہوتا۔ اور افسانہ نویس کو یا تو کلائی میکس خود ایجاد کرنا پڑتا ہے یا کسی مہمل فقرہ پر افسانے کو ختم کرنا ہوتا ہے۔ مثلاً ایک افسانہ نویس کو جب اور کوئی کلائی میکس نہ سوجھا تو اُس نے کہانی کو اِس فقرہ پر ختم کیا:" اور وہ سوچنے لگا۔ کہ کبوتر اُڑتے وقت ہوا میں قلابازیاں کیوں لگاتے ہیں۔" چنانچہ آپ کو متعدد ایسے افسانے ملیں گے۔ جن کا انجام نہایت غیر قدرتی معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً ایک مشہور افسانہ نویس کے طویل مختصر افسانے کا ہیرو ازدواجی رسوم کی ستم ظریفی برداشت نہیں کرسکتا۔ اور سماج کے مظالم کے متعلق اِس شدت سے سوچتا ہے کہ اُس کا دماغی توازن قائم نہیں رہتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ جنگل کی طرف بے تحاشا بھاگنے لگتا ہے۔ اور ایک کنوئیں کے پاس پہنچ کر اپنا سر پانی کی دھار کے نیچے رکھ دیتا ہے۔ اور سماجی بندھنوں کی سختی کو یکسر بھول کر کوئیں کی" روں روں روں" میں دلچسپی لینے لگتا ہے!

اوروں کی تو بات الگ۔ خود منشی پریم چند کے متعدد افسانے پلاٹ کے اعتبار سے غیر قدرتی معلوم ہوتے ہیں۔" آخری تحفہ" میں اُن کا ایک افسانہ ہے" برات" دیوکی نندن اپنی پہلی عورت پھول وتی کی موجودگی میں دوسری شادی کرنے جارہا ہے وہ پھولوں سے سجی ہوئی موٹر میں بیٹھ چکا ہے۔ عین اُس وقت پھول وتی موقع پر پہنچکر اُسے دوسری شادی کرنے سے منع کرتی ہے۔ وہ نہیں مانتا۔ پھول وتی موٹر کے سامنے لیٹ جاتی ہے۔ دیوکی نندن موٹر چلادیتا ہے۔ پھول وتی موٹر کے نیچے آکر مرجاتی ہے۔ اور ہجوم دیوکی نندن کو وہیں کھڑے کھڑے چیر پھاڑ کر رکھ دیتا ہے۔

ایک لاش کی بجائے دو لاشوں کا جنازہ اُٹھتا ہے۔

اب ذرا اس کہانی پر غور کیجیے۔ پہلی عورت کی موجودگی میں دوسری شادی کرنے کی مثالیں آپ کو زندگی میں اکثر مل جائیں گی۔ مگر جس طریقے سے منشی پریم چند نے ڈبل ٹریجیڈی بنانے کی کوشش کی ہے۔ اُس کی مثال کم از کم عام زندگی میں نہیں ملتی۔

اُن کا ایک اور افسانہ ہے "چمار"۔ جو شاید اُنہوں نے ترقی پسند تحریک کے زیر اثر لکھا۔ ایک چمار کسی برہمن کے ہاں اس غرض سے جاتا ہے۔ کہ موخر الذکر اس کے گھر آ کر کچھ مذہبی رسوم ادا کرے۔ برہمن اُس چمار کو لکڑیاں چیرنے کے لئے کہتا ہے، اور بیچارہ چمار لکڑیاں چیرتا چیرتا راہی ملک عدم ہوتا ہے۔ جس وقت برہمن کو اُسکی موت کا علم ہوتا ہے: وہ اُس کی لاش کو گھسیٹ کر کھیتوں میں پھینک آتا ہے۔ جہاں گیدڑ گدھ اور کوے اُسے نوچ نوچ کر کھا جاتے ہیں۔

جب پریم چند جیسا عدیم المثال افسانہ نویس اس قسم کی باتوں پر اُتر آئے۔ تو اس کے سوا چارہ ہی کیا ہے۔ کہ میں عاشق صاحب کے ساتھ اتفاق کروں کہ ہندوستانی زندگی میں افسانہ کے لئے پلاٹ نہیں ملتا ——

اہلِ زبان

قبلہ پطرس نے اپنے مضمون "لاہور کا جغرافیہ" میں ایک پتے کی بات کہی ہے کہ پنجاب کے حملہ آور دو راستوں سے پنجاب پر حملہ کرتے ہیں۔ شمال مغربی سرحدی صوبہ کی طرف سے اور یو پی کی جانب سے۔ مؤخر الذکر اہلِ زبان کہلاتے ہیں اور تخلص کرتے ہیں تعجب کا مقام ہے۔ کہ قبلہ پطرس جیسے نکتہ سنج مزاح نگار نے بنگال۔ مدراس اور بمبئی کے حملہ آوروں کا ذکر تک نہیں کیا۔ مانا کہ اہلِ زبان سب سے زیادہ خطرناک اور خوفناک قسم کے حملہ آور ہیں۔ یہ بھی درست سہی۔ کہ بنگال کے حملہ آور صرف کالجوں اور مدراس کے حملہ آور صرف اخبارات پر حملہ کرتے ہیں مگر بہر کیف اُن کا تذکرہ لازمی تھا۔ پطرس سے ہمیں یہ بھی شکایت ہے کہ اُنہوں نے اہلِ زبان کے متعلق پوری واقفیت بہم نہیں پہنچائی۔ کہ یہ لوگ کون ہیں۔ پنجاب پر کیوں حملہ کرتے

ہیں۔ اور پنجاب ان کے حملوں کی کیوں روک تھام نہیں کرتا۔ میں چاہتا ہوں کہ جدید تحقیق کی روشنی میں ان لوگوں کے متعلق کچھ لکھوں۔

وجہ تسمیہ

- اہلِ زبان اِس لیے اہلِ زبان نہیں کہلاتے۔ کہ وہ واقعی اچھی زبان بولتے یا لکھتے ہیں۔ بلکہ اس لیے کہ حُسنِ اتفاق سے وہ اُن اضلاع کے گرد و نواح میں پیدا ہوئے تھے۔ جہاں کہ آج سے دوسو سال پہلے زبان اُردو کو فروغ حاصل ہوا۔

شکل و شباہت

- شکل و شباہت کے اعتبار سے یہ لوگ مدقوق یا یتیم قسم کے انسان ہوتے ہیں جن کی وضع قطع پر مرزا غالب کا یہ شعر تھوڑی سی ترمیم کے بعد صادق آتا ہے۔

سو پشت سے ہے پیشہ آبا گداگری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

- جہاں تک جلد یا رنگ کا تعلق ہے۔ اہلِ زبان سیاہ فام ہوتے ہیں۔ اور ان کے چہرے کی سیاہی بسا اوقات ان کے دل کی سیاہی کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ اِن کا مرغوب لباس شیروانی ہے۔ دانت میلے کچیلے۔ مگر زبان شوخ و طرار۔ اکثر یہ گمان ہوتا ہے۔ کہ منہ میں زبان نہیں متعدد قینچیاں لگی ہوئی ہیں۔

خوراک

- غمِ اُردو کے علاوہ جھوٹی قسمیں اور پان کھاتے ہیں۔

تعلیم

عموماً پرائمری پاس ہوتے ہیں۔ اس کے بعد سلسلہ تعلیم اس لئے منقطع

کرنا پڑتا ہے۔ کہ والدین کا سایہ سر سے اُٹھ جاتا ہے اور مقامی یتیم خانے میں انتظام نہیں ہوسکتا۔ پنجاب میں آکر البتہ منشی فاضل کا امتحان پاس کر لیتے ہیں اور دس پندرہ برس لاہور میں رہنے کے بعد شمس العلما کہلاتے ہیں۔

تکیہ کلام

ان کا تکیہ کلام چند الفاظ پر مشتمل ہوتا ہے جن میں سے "واللہ"۔ "آداب عرض"۔ "ذرہ نوازی" خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ واللہ کا استعمال اس کثرت سے کرتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے۔ کوئی فقرہ واللہ کے بغیر مکمل ہی نہیں ہوسکتا۔ مثلاً "واللہ میں کچھ اتنا بیوقوف بھی نہیں۔ جتنا آپ مجھے سمجھتے ہیں واللہ۔ آپ مجھے جتنا بناتے ہیں واللہ مجھے اُتنی مسرت ہوتی ہے واللہ"۔

حملے کی وجہ

اہلِ زبان کے پنجاب پر حملہ کرنے کی وجہ کم و بیش وہی ہیں۔ جو اہلِ سیف کی تھیں یعنی غربت اور فاقہ کشی۔ جب اہلِ زبان وطنِ مالوف میں بھوکوں مرنے لگتے ہیں۔ تو پنجاب کا رُخ کرتے ہیں۔ روایت ہے ایک دفعہ کسی نے ڈاکٹر جانسن سے پوچھا۔ جب اہلِ سکاٹ لینڈ کو حصولِ معاش کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ تو وہ کونسا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: "وہ راستہ جو سکاٹ لینڈ سے لندن کو جاتا ہے"۔ یہی حال اہلِ زبان کا ہے۔ جب ایک دفعہ یہ اپنے وطن سے باہر قدم رکھتے ہیں۔ تو پھر انہیں وطن کی زیارت نصیب نہیں ہوتی۔ امیر کے اس شعر کے مصداق

کیسی گھڑی بھی گھر سے جو نکلا تھا میں غریب   پھر دیکھنا نصیب نہ مجھ کو وطن ہوا۔

نیز دیارِ غیر ہیں یہ لوگ اس لئے مرنا پسند کرتے ہیں۔ کہ وہاں خدا ان کی بے کسی کی لاج رکھ لیتا ہے۔

ہتھیار

اہلِ زبان تین چیزوں سے مسلح ہو کر پنجاب پر حملہ کرتے ہیں۔ (۱) ٹوکرا۔ جو ان کے سر پہ ہوتا ہے۔ اور جس میں بقول عاشق بٹالوی لکھنؤ یا دہلی کی ٹکسالی زبان برائے فروخت رکھی ہوتی ہے۔ (۲) کشکول۔ جو ان کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ اور بسا اوقات دونوں ہاتھوں میں ہوتا ہے۔ (۳) قلم۔ جو کان پر دھرا ہوتا ہے جس سے یہ لوگ اہلِ پنجاب کی زبان کی اصلاح فرماتے ہیں۔

حملے کا مقصد۔ جب اہلِ زبان پنجاب کے دار الخلافے پر دھاوا بولتے ہیں۔ تو اپنی تشریف آوری کے جواز میں عجیب و غریب دلائل پیش کرتے ہیں۔ بیشتر تو یہ کہتے ہیں کہ وہ لکھنؤ یا دہلی سے پنجابی ادبا کی تذکیر و تانیث درست کرنے آتے ہیں۔ "دیکھئے صاحب پنجابی شعرا دہی کو مؤنث باندھتے ہیں۔ حالانکہ اساتذہ نے ہمیشہ اسے مذکر باندھا ہے۔ جناب ہمبل لکھنوی کا شعر ہے۔

کھا کے میٹھا دہی وہ کہتے ہیں
کتنی اس میں مٹھاس ہے پیارے

اور ملاحظہ فرمائیے۔ اُمی بیگم صاحبہ کا شعر ہے

بوا ہم تو کھائیں گے میٹھا دہی
جو مہنگا ملے گا۔ تو مہنگا سہی

اور صاحب مجھے حیرانی ہوئی واللہ۔ کہ اہل پنجاب پنسل کو بھی مؤنث خیال کرتے ہیں

حالانکہ یہ لفظ مذکر ہے۔ جاہل عظیم آبادی فرماتے ہیں ؎

میں نے خط اتنے لکھے کہ گھس گیا پنسل میرا
آپ نے لیکن نہ لکھنا تھا۔ نہ لکھا ہے جواب

اسی انداز میں "بلبل" "قلم" "الوداع" کی تذکیر و تانیث پر بحث کی جاتی ہے۔ تذکیر و تانیث کے بعد لازم و متعدی کے جھگڑے چکائے جاتے ہیں۔ پنجاب کی درسی کتب کی اصلاح کا بیڑہ اٹھایا جاتا ہے۔ اور پنجابی ادبا کا تلفظ درست کیا جاتا ہے

سلسلہ تلمذ

ان اہم مقاصد کے علاوہ اہل زبان کا پنجاب پر حملہ کرنے کا ایک اور مقصد بھی ہوتا ہے۔ اور وہ ہے پنجابی شعرا کو اپنے حلقۂ تلمذ میں لینا۔ خوش قسمتی سے تقریباً تمام اہل زبان پیدائشی شاعر ہوتے ہیں۔ اکثر تو پانچ برس کی عمر میں شعر کہنا شروع کرتے ہیں۔ اور بیشتر بارہ برس کی عمر میں اپنا پہلا دیوان مرتب کر لیتے ہیں۔ اور بیس برس کی عمر میں یا تو شہریار دکن کے کلام کی اصلاح فرماتے ہیں۔ یا کسی معروف شاعر کی جانشینی کے متعلق الٰہ آباد ہائی کورٹ میں مقدمہ دائر کرتے ہیں۔ اہل زبان خود اچھا شعر اتفاق سے ہی کہہ سکتے ہیں۔ مگر انہیں اساتذہ کے تمام اچھے اشعار ازبر ہوتے ہیں۔ اہل زبان اپنا کلام ترنم سے پڑھتے ہیں۔ چاہے اُن کی آواز آپ کے مینڈھے کی آواز سے ملتی جلتی کیوں نہ ہو۔ بعض کم بخت تو پڑھتے وقت طنبورا بجانا بھی شروع کر دیتے ہیں۔

محاصرہ

اہل زبان حملہ کرنے کے بعد دو جگہوں کا محاصرہ کرتے ہیں (۱) ریڈیو سٹیشن

(۲) ایسے ہال جہاں مشاعرے منعقد ہوتے ہیں۔

تجارت

انگریز حملہ آوروں کی مانند و۔ اصل اہلِ زبان تجارت پیشہ لوگ ہیں۔ اِسلئے ملک فتح کرنے کے بعد غزلوں اور نظموں کا بیوپار شروع کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کے ہاں غزلیں۔ قصیدے۔ سہرے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ چاہے آپ لکھنوی انداز کی غزل خریدیں۔ چاہے دہلوی انداز کی قیمت ہر حالت میں دو کباب اور ایک چائے کی پیالی ہوگی۔ البتہ اگر جدید شاعری کی نظم چاہیں۔ تو مفت مل جائے گی۔

شکایات۔

اہلِ زبان کو اہلِ پنجاب سے دو شکایات ہیں۔ (۱) پنجابی ادباء سے لکھنوی اور دہلوی گھسیارے بہتر اُردو لکھتے ہیں۔ (۲) پنجاب نے سوائے اقبال اور ظفر علی خاں کے کوئی شاعر یا ادیب پیدا نہیں کیا۔

حملے کی روک تھام

چونکہ اہلِ زبان محمود غزنوی کی طرح سترہ بار سے کم حملہ نہیں کرتے۔ اِس لئے اُن کے حملوں کی روک تھام نہایت مشکل ہے۔ تاہم حفظِ ماتقدم کے طور پر جب کبھی اہلِ زبان کو لاہور یا لاہور کے آس پاس منڈلاتے ہوتے دیکھیں۔ اُن سے مرعوب ہونے کی بجائے دہلی یا لکھنؤ کا ٹکٹ خرید کر اُنہیں لاہور سے یوپی جانے والی پہلی گاڑی میں سوار کرا دیں۔

آگ جلانا

بظاہر آگ جلانا سہل ترین فعل ہے۔ اتنا سہل جتنا کپڑے یا نقل اُتارنا۔ لیکن اگر غور کیجئے۔ تو یہ سب کہنے کی باتیں ہیں کیونکہ در اصل آگ جلانا اتنا ہی مشکل ہے جتنا آگ بجھانا۔ بلکہ آگ بجھانا آسان ہے۔ اور آگ جلانا مشکل۔ فرض کیجئے: آپ کے گھر کو آگ لگ جاتی ہے۔ یا آپ خود ہی گھر کو آگ لگا دیتے ہیں۔ یونہی دل بہلانے کے لیے یا "تیرگیِ شامِ غم" مٹانے کے لیے۔ اُس حالت میں آپ فائر بریگیڈ کو فون کر سکتے ہیں۔ لیکن جہاں تک آگ جلانے کا تعلق ہے۔ آپ کسی سرکاری یا غیر سرکاری شعبہ سے مدد طلب نہیں کر سکتے۔ میں حسد کی آگ جلانے کا ذکر نہیں کر رہا۔ وہ فعل تو مقابلتاً آسان ہے۔ اُدھیڑ عمر میں کسی نوجوان لڑکی سے شادی کر لیجئے۔ یا نہایت پُر تکلف موٹر کار خرید لیجئے۔ آپ اپنے دوستوں اور ہمسایوں

کے سینہ میں حسد کی آگ جلانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ مگر میں تو صرف آگ جلانے کے متعلق عرض کر رہا ہوں۔ یوں سمجھئے۔ کہ آپ چائے پینے کے عادی ہیں۔ اور آپ کی بیوی یک لخت بیمار پڑ جاتی ہے۔ اور آپ کا نوکر بیوی کے بیمار ہونے سے ایک دن پہلے بھاگ جاتا ہے تو اس حالت میں آپ کیا کریں گے۔ آپ کہیں گے "یہ تو سیدھی سی بات ہے۔ ہم کسی ہوٹل میں تشریف لے جائیں گے۔" لیکن یہ اس وقت ممکن ہے۔ جب آپ کی جیب میں پیسے ہوں۔ یا آپ کو ہوٹل کی چائے گوارا ہو۔ اگر یہ دونوں باتیں نہ ہوں۔ تو پھر آپ وہی کریں گے۔ جو میں نے گذشتہ اتوار کو کیا۔ یعنی آپ آگ جلانے کی کوشش کریں گے۔

میں نے دو موٹی موٹی لکڑیاں چولھے میں ایک دوسرے کے ساتھ ساٹھ درجے کا زاویہ بناتے ہوئے رکھیں۔ اور ان کے نیچے ایک ردی کاغذ کا ٹکڑا۔ کاغذ کو دیا سلائی دکھائی۔ فوراً آگ لگ گئی۔ میں نے سمجھا کہ آدھی مہم سر کر لی۔ مگر ایک آدھ سیکنڈ میں کاغذ پروانے کی طرح جل کر راکھ ہو گیا۔ اور لکڑیاں شمع کی طرح جلنے کی بجائے ویسی کی ویسی رہیں۔ وجہ یہ کہ کاغذ خشک تھا۔ اور لکڑیاں گیلی۔ ایک اور کاغذ نیچے رکھا۔ اور پھر وہی عمل دہرایا۔ مگر اب کی بار بھی وہی حشر ہوا حتےٰ کہ سارا اخبار جل گیا۔ اخبار کے بعد ایک اردو رسالہ نذر آتش کیا۔ ازاں بعد ایک انگریزی رسالہ۔ ایک چھوٹی سی ہندی نظموں کی کتاب۔ لیکن جب کوئی امید بر نہ آئی تو لائبریری سے ایک موٹی سی کتاب اٹھا لایا۔ شاید کوئی مقدس کتاب تھی یا لغت جس کو پڑھنے کی بجائے میں بسا اوقات سرہانے کے طور پر استعمال کیا کرتا تھا۔ چند اوراق پھاڑے اور جلدی سے چولھے میں جھونک دیئے۔ مگر لکڑیوں نے تو گویا جلنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ نہایت پریشان

ہوا۔ سوچا کہ ساری لائبریری کو نذرِ آتش کیا جائے۔ اور یہ سوچتے ہی ایک نئی حقیقت کا انکشاف ہوا۔ کہ ہندوستان کے بعض حملہ آور کتب خانوں کو کیوں نذرِ آتش کیا کرتے تھے۔ بیچاروں کو آگ جلانے کی ضرورت درپیش آئی ہو گی۔ اور لکڑیاں ہونگی گیلی۔ مگر ہمارے مؤرخوں کی کج فہمی ملاحظہ فرمایئے۔ کہ بجائے اُن لوگوں سے ہمدردی کرنے کے اُنہیں وحشی۔ جاہل اور نہ جانے کیا کیا کہتے ہیں۔ لائبریری میں گیا۔ شش و پنج میں پڑ گیا۔ کہ کونسے شاعر۔ ادیب یا نقاد کے کلیات کی خدمات حاصل کی جائیں۔ کرہ ملٹن کی مشہور تصنیف پیراڈائس لاسٹ (Paradise Lost) پر پڑا۔

بات دراصل یہ ہے کہ مجھے اس کتاب سے چڑ ہے۔ مجھے اس کتاب کا صرف سرورق پسند ہے۔ اور شاید یہی وجہ ہے۔ کہ میں نے اسے خریدا۔ مگر یہ کتاب اتنی مشکل ہے کہ جب کبھی میں نے اسے پڑھنے کی کوشش کی۔ سر چکرانے لگا۔ "چلو" میں نے دل میں کہا۔ "آئے دن کی زحمت سے نجات ملی۔ خس کم جہاں پاک"۔ مگر جونہی میں اسے جھونک کر معلوم ہوا۔ کہ آگ بھی اسے چھونے سے ڈرتی ہے۔ تھک ہار کر میں نے کلیاتِ شیکسپیئر کی پناہ لی۔ میں نے کہا۔ "اے دنیا کے سب سے بڑے ڈرامائسٹ۔ نفسیات کے ماہر۔ تو ہمیشہ آڑے وقت میں نوعِ بشر کے کام آیا ہے اس وقت سخت مصیبت میں مبتلا ہوں۔ ہو سکے تو میری مدد کر۔" میں نے مشہور ڈرامہ رومیو اور جولیٹ کا ایک ورق پھاڑا۔ اور جونہی اُسے آگ لگائی۔ لکڑیوں سے شوں شوں کی آواز اٹھتی ہوئی سنائی دی۔ "مرحبا شیکسپیئر۔" میں نے خوشی سے اُچھل کر کہا۔ "تو نے رومیو اور جولیٹ میں وہ آگ بھر دی ہے۔ کہ لکڑیاں تو لکڑیاں پتھر بھی ہوں تو اُن میں سے شرارے بلند ہوتے دکھائی دیں۔" میں اس قسم کی

شاعری کر رہا تھا۔ کہ یک لخت کسی نے دروازے پر دستک دی۔ میرا چھوٹا لڑکا بھاگتا ہؤا گیا۔ اور پیشتر اس کے کہ میں اندر سے پکار کر کہتا۔ کہ میں گھر پر نہیں ہوں۔ اُس نے نو وارد کو بتایا۔ کہ میں باورچی خانے میں آگ جلا رہا ہوں۔

چنانچہ جس وقت میں سر پر سے راکھ جھاڑتا ہؤا۔ آنکھیں ملتا ہؤا کمرے میں داخل ہؤا۔ اُس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا: "واہ حضرت! آج پکڑے گئے نا۔ روز ہم پر رُعب جماتے تھے۔ کہ بیوی ہمارے اشارے پر ناچتی ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ آگ تک خود جلاتے ہیں۔" جی میں آیا۔ کہ اُس کے سر پر وہ دھول جماؤں کہ ساری شیخی کرکری ہو جائے۔ مگر موقع محل دیکھ کر کہا۔ "بھئی آگ جلانا میری ہابی (Hobby) یعنی شغل ہے۔ مدت سے سوچ رہا تھا۔ کہ کوئی ہابی ہونی چاہیئے۔ آج خیال آیا کیوں نہ آگ جلانے کو ہابی بنایا جائے۔ بخدا بہت لطف آتا ہے۔ ادھر دو لکڑیاں چولھے میں ساٹھ درجے کا زاویہ بناتے ہوئے رکھیں۔ اُدھر......

مگر وہ کم بخت مذاق اُڑانے پر تلا ہؤا تھا۔ اِس لئے بات کاٹ کر کہنے لگا۔ "ہاں یار۔ کیوں جھوٹ بولتے ہو۔ صاف کیوں نہیں کہتے۔ کہ سخت بزدل قسم کے زن مرید ہو۔"

لاکھ کوشش کی۔ کہ کسی طرح اُس کو یقین دلاؤں۔ کہ آگ جلانا واقعی میری "ہابی" ہے۔ مگر وہ کب مانتا تھا۔ باتوں باتوں میں پتہ چلا۔ کہ اُس نے ایک نئی کتاب لکھی ہے۔ جس کی ایک کاپی مجھے اِس غرض سے دینے آیا ہے۔ کہ میں اُس پر تنقید لکھوں۔ کتاب کا نام ہے۔ "افسانہ کس طرح لکھنا چاہیئے"۔ میں نے شکریہ کے ساتھ کتاب رکھ لی۔ اور دِل میں کہا۔ "اگر بدبخت اِس موضوع پر کتاب لکھتا۔ کہ آگ کس

طرح جلانی چاہیئے۔ تو بھی کچھ بات تھی۔ افسانہ لکھنا کون نہیں جانتا؟" وہ چلا گیا۔ اور معاً مجھے خیال آیا۔ کہ اگر اب تک آگ نہ جلی ہو۔ تو اِس نئی کتاب کی اعانت حاصل کی جائے۔ باورچی خانے میں پہنچا۔ معلوم ہؤا۔ کہ وہی ہؤا جس کا مجھے خطرہ تھا یعنی لکڑیاں ویسی ہی پڑی تھیں۔ اور راکھ اِدھر اُدھر بکھری ہوئی تھی۔ چنانچہ اِس دفعہ میں نے شیکسپیئر کی بجائے اپنے دوست کی کتاب کو موقع دیا۔ جب ورق پھاڑ پھاڑ کر تقریبًا ساری کتاب ختم کر چکا۔ تو یک لخت لکڑیوں میں ایک چھوٹا سا شعلہ لپکا۔ اور خلافِ توقع لکڑیوں نے جلنا شروع کیا۔ بہت خوش ہؤا اس لئے نہیں کہ آگ جلنے لگی تھی۔ بلکہ اِس لئے کہ مجھے ایک فضول کتاب پر تنقید لکھنے کی زحمت سے چھٹکارا ملا۔ جلدی سے کیتلی میں چائے کے لئے پانی ڈالا اور اُسے چولھے پر چڑھایا۔ چائے لانے کے لئے سٹور روم میں گیا۔ مگر چائے غائب۔ اِدھر اُدھر ڈھونڈا کہیں نہ ملی۔ آخر ایک ہمسائے سے اُدھار لی۔ مگر جب واپس آیا۔ تو یہ دیکھ کر سخت حیرانی ہوئی۔ کہ آگ بالکل بجھ چکی ہے اور کیتلی خالی ہے۔ غور کرنے پر معلوم ہؤا۔ کہ کیتلی کے پیندے میں ایک چھوٹا سا سوراخ تھا۔ جس میں سے پانی ٹپک ٹپک کر آگ پر پڑتا رہا اور جب تک میں چائے تلاش کرتا رہا۔ پانی نے آگ کا قلع قمع کر دیا۔ چنانچہ اب نہ آگ تھی۔ نہ پانی۔ جی میں آیا۔ ایک دفعہ پھر آگ جلانے کی کوشش کی جائے۔ پھر خیال آیا ؏ آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک۔ پھر سوچا۔ ؎ یہ نہ تھی ہماری قسمت ..... سوچا۔ اور بہت سوچا۔ مگر آخر فیصلہ یہی کیا۔ کہ آج چائے کے بغیر ہی گذارہ کیا جائے۔

شیشہ و تیشہ

(مضامینِ طنز و مزاح)

کنہیا لال کپور

اِنکم ٹیکس والے

منکر نکیر اور محکمہ انکم ٹیکس کے انسپکٹروں میں یہی فرق نہیں۔ کہ منکر نکیر مرنے کے بعد حساب مانگتے ہیں۔ اور مؤخر الذکر مرنے سے پہلے۔ بلکہ یہ کہ منکر نکیر صرف ایک بار حساب مانگتے ہیں۔ اور انکم ٹیکس کے انسپکٹر بار بار۔ نیز یہ کہ منکر نکیر گناہوں کا حساب لیتے وقت ثواب کو نظر انداز نہیں کرتے۔ مگر انکم ٹیکس تجویز کرنے والے صرف گناہوں میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ ثواب سے اُنہیں کوئی سروکار نہیں۔ آمدنی کو گناہ اشتراکیوں کی اصطلاح میں کہہ رہا ہوں۔ ملاحظہ ہو۔ اشتراکی فلاسفر کا نظریہ کہ تمام صاحبِ جائداد چور ہیں"۔

اِدھر مارچ کا مہینہ آیا۔ اُدھر اُن کے پیام آنے شروع ہوئے۔ کہ صاحب ایک ہفتہ کے اندر اندر آمدنی کا نقشہ پُر کر کے دفتر میں بھیج دیجئے۔ ورنہ آپ پر

زیر دفعہ "فلاں" مقدمہ چلایا جائے گا۔ اسے کہتے ہیں مفت خوری اور سینہ زوری۔ بھلا کوئی ان سے پوچھے کہ صاحب جب ہم سارا دن دفتر میں پنسل گھساتے تھے۔ افسروں کی گھڑکیاں سہتے تھے۔ سپرنٹنڈنٹوں کے ناز اُٹھاتے تھے۔ اُس وقت آپ کہاں تھے۔ کبھی بھُولے سے بھی یہ نہ کہا" لاؤ اِن رقموں کی میزان میں کر دوں یا اس فائل سے میں نپٹ لوں گا" اور جب دو چار پیسوں کا منہ دیکھنا نصیب ہُوا۔ تو آپ آدھمکے۔ اور لگے رعب جمانے۔ کہ ہمارا حصّہ لائیے۔ اگر عاجزی سے مانگیں تو کوئی عیب نہیں۔ کہ راہِ اللہ ہم غریبوں کو بھی دو۔ جے ملی گر تم کو ثروت چند روز مگر یہاں تو اس کر دفر سے مطالبہ کیا جاتا ہے۔ گویا ہم کماتے انہی کے لئے ہیں۔ اور یہ بیوی بچّوں کا قصّہ تو گویا الف لیلہ کی داستان ہے۔ مگر صرف مطالبہ پر ہی معاملہ ختم نہیں ہو جاتا۔ آمدنی کا نقشہ پُر کرنے کے بعد ایک دن دفتر میں بھی تشریف لائیے۔ تاکہ اندراج کی تصدیق کی جا سکے۔ اور جب آپ اپنا قیمتی وقت ضائع کر کے وہاں جاتے ہیں۔ تو آپ کی کیا گت بنائی جاتی ہے۔ برآمدے میں جہاں آپ کو گھنٹوں انتظار کرنا ہے۔ کوئی بینچ یا کرسی نہیں۔ دوسرے جتنا عرصہ آپ برآمدے میں کھڑا رہتے ہیں۔ دفتر میں کام کرنے والے بابو اور چپڑاسی آپ کو اس طرح گھور گھور کر دیکھتے ہیں۔ گویا آپ جیل سے بھاگے ہوئے مجرم ہیں۔ مگر سب سے بڑی کوفت یہ کہ محکمہ انکم ٹیکس کے انسپکٹر اپنے آپ کو فرعون یا کم از کم ہٹلر سے کم نہیں سمجھتے اس لئے جب آپ جُھک کر سلام بجا لاتے ہیں۔ تو وہ یا تو منہ دوسری طرف پھیر لیتے ہیں۔ یا پھر سگار کا دھواں آپ کے منہ کی طرف چھوڑتے ہوئے آپ پر یوں نگاہِ غلط انداز ڈال لیتے ہیں۔ جیسے آپ انسان نہیں بلکہ رینگنے والے کیڑے

اور اس کے بعد گستاخانہ استفسارات کا سلسلہ

"یہ نقشہ آپ نے پُر کیا ہے"

"جی ہاں"

"آپ کا ہی نام ہے دین دیال"

"جی ہاں"

"آپ کہاں پروفیسر ہیں"

"کلچرل کالج ہیں"

"آپ کی تنخواہ"

"ایک سو بیس روپیہ ماہانہ"

اور آپ دل ہی دل میں جھنجھلا کر کہتے ہیں۔ کم بخت اندھا ہے۔ پڑھ نہیں سکتا۔ نقشے میں اِن تمام سوالوں کے جواب لکھ تو دیئے تھے۔ اس قسم کے تین چار بے ضرر سوالات کرنے کے بعد آمدم برسرِ مطلب والا معاملہ شروع ہوتا ہے

"ہاں تو آپ نے تنخواہ کے علاوہ اپنی بالائی آمدنی کیوں نہیں دکھائی"

"جناب" آپ منکسرانہ لہجے میں کہتے ہیں۔"تنخواہ کے علاوہ میری کوئی اور آمدنی نہیں"

"ہُوں" وہ منہ سے پائپ یا سگار نکال کر طنزیہ انداز میں فرماتے ہیں۔ "اور وہ جو جناب نے "کبوتر نامہ" لکھا تھا۔ اُس کی رائلٹی کیا ہوئی"

"جی کیا عرض کروں۔ بندہ پرور۔ سال بھر میں کُل تین کاپیاں فروخت ہوئیں جن پر ساڑھے تیرہ آنے رائلٹی ملی"

"ساڑھے تیرہ آنے سے مطلب نہیں۔" وہ گرج کر فرماتے ہیں۔ "آمدنی کے نقشہ میں اسے دکھانا چاہیئے۔"

آپ دبی زبان سے اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہیں۔ وہ غرا کر پھر پوچھتے ہیں۔

"اور وہ جو آپ کو آل انڈیا ریڈیو سے معاوضہ ملا۔ وہ کیوں نہیں دکھایا؟"

"اجی حضرت وہ کیا معاوضہ تھا۔ اڑھائی منٹ کے لئے بچوں کے ایک فیچر پروگرام میں گیدڑ کا پارٹ ادا کیا تھا۔ جس کے لئے اڑھائی روپے ملے۔ اب میں وہ کیا آمدنی کے نقشہ میں دکھاتا۔"

وہ اسی فرعونیت کے ساتھ جواب دیتے ہیں۔

"کچھ بھی ہو۔ اندراج مکمل ہونا چاہیئے۔"

چند ثانیوں کی اذیت بخش خاموشی کے بعد وہ پھر آپ کو مخاطب کرتے ہیں۔

"ہاں اور وہ جو آپ رائے بہادر سینا مل کی لڑکی کو بطور معلم پڑھاتے رہے۔ وہ ٹیوشن فیس آپ نے درج نہیں کی۔"

"جناب۔ رائے بہادر بیس روپے ماہوار ہی تو دیتے تھے۔ اور اُن کی کوٹھی بھی غریب خانے سے چھ میل دور۔ پندرہ روپے ماہوار تانگے والا لے لیتا۔ باقی رہے پانچ۔ اُن سے بمشکل سگرٹ پان کا خرچ چلتا۔" مگر وہ دہاڑ کر کہتے ہیں

"آمدنی آمدنی ہے۔ پانچ ہو یا پچاس۔"

اور آپ بیحد مرعوب ہو کر سوچنے لگتے ہیں۔ یہ کم بخت انکم ٹیکس والے حساب دان ہونے کے علاوہ غضب کے سراغ رساں بھی ہوتے ہیں۔ آپ کی آمدنی کے متعلق آپ سے بھی زیادہ جانتے ہیں۔ حالانکہ آپ نے آل انڈیا ریڈیو کی لاج رکھنے کے لئے

اڑھائی روپے کی گرانقدر رقم کا ذکر نہیں کیا۔ اور حالانکہ "کبوتر نامہ" کی رائلٹی آپ کے ذہن سے بالکل اتر چکی ہے۔ مگر انہیں سب کچھ یاد ہے۔ آپ کی آمدنی کے تمام ذریعوں کا پتہ ہے۔ آپ یہ سوچ ہی رہے ہوتے ہیں۔ کہ وہ لال لال آنکھیں نکال کر کہتے ہیں۔ "آپ کو معلوم ہے۔ آمدنی چھپانا جرم ہے۔" اور پیشتر اس کے کہ وہ آپ کو تعزیراتِ ہند کے اس دفعہ کا حوالہ دے سکیں جس کے ماتحت آپ کو گرفتار کیا جاسکتا ہے۔ آپ معافی مانگنے پر اتر آتے ہیں۔ اور یہ ہے وہ بات جس پر انکم ٹیکس کے انسپکٹروں کو ناز ہے۔ کہ کلچرل کالج کا پروفیسر دین دیال جو ایم۔ اے ہونے کے علاوہ ایل ایل بی بھی ہے۔ ان سے گڑگڑا کر معذرت کر رہا ہے۔ اور در اصل اسی امر کے لئے تو آپ کو دفتر میں طلب کیا گیا تھا۔ تاکہ انسپکٹر صاحب اپنے احباب کے زمرے میں مونچھوں پر تاؤ دیکر کہہ سکیں۔ "ابھی ہماری موجودگی میں بڑوں بڑوں کے زہرے آب ہو جاتے ہیں۔ پرسوں کلچرل کالج کے ایک پروفیسر کو اتنا دھمکایا کہ بیچارہ تھر تھر کانپنے لگا......"

سگار کے دو چار کش اور لگانے کے بعد وہ آپ کی معذرت قبول فرما لیتے ہیں جس کا پتہ اس بات سے چلتا ہے۔ کہ وہ آپ کو بیٹھنے کے لئے کرسی پیش کرتے ہیں مگر رخصت ہوتے وقت یہ خوشخبری آپ کے گوش گذار کی جاتی ہے۔ کہ انہوں نے آپ کی حالتِ زار پر رحم کھاتے ہوئے صرف ایک سو بیس روپیہ انکم ٹیکس تجویز کیا ہے۔ کہ جو آپ کی ایک مہینہ کی پوری تنخواہ ہے۔ اس پر بھی آپ ناراض ہونے کی بجائے ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ مگر جب گھر لوٹتے ہیں تو دل ہی دل میں کہتے ہیں "آمدنی آمدنی ہے۔ پانچ ہو۔ یا پچاس۔ خوب۔ مگر کیا خرچ خرچ نہیں۔ پانچ سو ہو

یا پانچ ہزار" اور اُس وقت آپ کا جی چاہتا ہے۔ کہ کاش یہ زباں دراز افسر آپ کے اخراجات کا بھی جائزہ لے سکتا۔ اور جیسے اُسے آپ کی آمدنی کے تمام ذرائع معلوم ہیں کاش اُسے آپ کے خرچ کی تفاصیل بھی اسی طرح ازبر ہوتیں۔ کاش اُسے یہ پتہ ہوتا کہ آپ کی آدھی سے زیادہ آمدنی بیوی کی ساڑھیوں پر خرچ ہوتی ہے۔ ایک چوتھائی سے کچھ کم بن بلائے مہمانوں کی آؤ بھگت میں اور باقی ایک چوتھائی آپ کے فیملی ڈاکٹر کی جیب میں چلی جاتی ہے۔ اور اگر آپ کا ہمسایہ آپ کو قرض نہ دے۔ تو شاید آپ کو کسی یتیم خانے کی پناہ لینی پڑے۔ اور آپ سرد آہ کھینچ کر کہتے ہیں "ایک سو بیس روپئے انکم ٹیکس تجویز کرنے والے نادان! اگر تجھے واقعی میرے اخراجات کا علم ہوتا۔ تو تو انکم ٹیکس تجویز کرنے کی بجائے گورنمنٹ آف انڈیا سے مجھے سپیشل وظیفہ دلواتا۔ مگر افسوس تو یہی ہے۔ کہ تجھے میرے اخراجات کا علم نہیں۔

چڑیا گھر

فرشتے نے اپنے ساتھی سے کہا۔ "اب میں تمہیں دنیا کے سب سے بڑے چڑیا گھر کی سیر کراؤں گا۔" تھوڑی دیر اور فضا میں اُڑنے کے بعد دونو ایک وسیع اور عریض چڑیا گھر میں داخل ہوئے۔ اس میں متعدد پنجرے تھے۔ جن میں طرح طرح کے پرندے اور جانور مقید تھے۔ سب سے پہلے فرشتے نے اپنے ساتھی کو ایک جانور دکھایا۔ سر صفاچٹ۔ ٹھوڑی پر لمبے لمبے بال۔ دُم بالکل غائب۔ پنجرے کے باہر لکھا ہوا تھا۔ "اس پنجرے کے نزدیک قینچی یا اُسترا لیجانا سخت منع ہے۔" ساتھ والے پنجرے میں ایک مادہ قید تھی۔ وہ کپڑے کے غلاف میں اس طرح لپیٹی گئی تھی۔ کہ یہ پتہ چلانا مشکل تھا۔ کہ یہ غلاف ہے یا کفن فرشتے کے ساتھی نے پوچھا۔ "یہ غلاف کو اُتار کیوں نہیں پھینکتی۔" فرشتہ نے کہا۔ "اسلئے کہ اسے ہوا نہ لگ جائے۔" چلتے چلتے فرشتہ اور اُس کا ساتھی طوطوں کے پنجرے

کے سامنے رُکے۔ دیکھا کہ طوطے آپس میں بڑے جوش وخروش سے لڑ رہے ہیں۔ کچھ طوطے کہتے تھے۔ اِس چڑیا گھر کی ایک بولی ہونی چاہیئے۔ اور وہ ہے "اُر اُر" باقی کہتے تھے۔ اِس چڑیا گھر کی صرف ایک ہی بولی ہو سکتی ہے۔ اور وہ ہے "ہِن ہِن" "اُر اُر" والے کہتے۔ "اُر اُر" بولنا متاباتاً سہل ہے "اُر اُر" میں بہت مٹھاس ہے۔" اس پر "ہِن ہِن" والے مچل کر کہتے: "ہِن ہِن" ہمارے بزرگوں کی بولی ہے۔ "ہِن ہِن" نے ہی "اُر اُر" کو جنم دیا۔ ہِن ہِن ماں ہے۔ اور "اُر اُر" بیٹی۔ ہم بوڑھی ماں کو چھوڑ کر جوان بیٹی کی کبھی طرفداری نہ کریں گے۔ اس کے بعد وہ پھر لڑنا شروع کر دیتے۔ ادھر سے ایک جماعت پکارتی "اُر اُر"۔ اُدھر سے دوسری چلا کر کہتی: "ہِن ہِن" فرشتے کا ساتھی یہ تماشا دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اِس سے اگلے پنجرے میں کچھ گیدڑ اس طرح غرّا رہے تھے۔ گویا وہ گیدڑ نہیں بلکہ شیر ہیں۔ گیدڑوں کا لیڈر غرّا کر کہتا: "ہم بہادر ہیں۔ کیونکہ ہمارے بزرگ بہادر تھے۔" باقی گیدڑ کہتے "کیا ہوا ہم آج گیدڑ کہلاتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا۔ کہ شیر اور چیتے ہم سے خوف کھاتے تھے" فرشتے کا ساتھی مسکرایا۔ اور کہنے لگا۔

"یہ کیا بوالعجبی ہے۔" فرشتے نے کہا۔ "اِس چڑیا گھر میں اس سے بھی بڑی بوالعجبیوں کی مثالیں ملتی ہیں۔" اِس پنجرے سے تھوڑے سے فاصلے پر چند خرگوش اِس موضوع پر بحث کر رہے تھے۔ کہ پنجرے کا مالک کون ہے۔ سفید رنگ کے خرگوش کہتے: "ہم کیونکہ ہم اِس پنجرے میں پہلے آئے۔" خاکی رنگ کے خرگوش کہتے: "ہم۔ کیونکہ ہم بعد میں آئے۔" پنجرے کے اصلی مالک جو رنگ میں کالے تھے۔ پنجرے کے جنوبی اور مشرقی کونوں میں دبک کر بیٹھے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی وہ پکار اُٹھتے: "پنجرے کے مالک نہ سفید رنگ کے خرگوش ہیں۔ نہ خاکی رنگ کے۔ بلکہ ہم تم سب غاصب ہو

سے تھے کہ چڑیا گھر کا موجودہ مالک بھی غاصب ہے۔"

فرشتہ اور اُس کا ساتھی اب ایک ایسے پنجرے کے قریب آئے جس میں بہت سے دم کٹے بندر اس لئے بر سرِ پیکار تھے۔ کہ بندر کی قدرتی خوراک سبزی ہے یا گوشت۔ بہت سے بندر سبزی کے حق میں تھے۔ مگر چند بندروں کو گوشت پسند تھا۔ چنانچہ سبزی پسند بندر، گوشت خور بندروں کو ناپاک سمجھتے تھے۔ مگر مصیبت یہ تھی۔ کہ جن بندروں کو گوشت پسند تھا۔ اُن کے بھی دو گروہ تھے۔ ایک گروہ سمجھتا تھا۔ کہ اُس جانور کا گوشت اچھا ہے۔ جسے آہستہ آہستہ موت کی نیند سلایا جائے۔ دوسرا گروہ کہتا۔ کہ اُس جانور کا گوشت کھانا چاہیئے۔ جس کا کام جلدی جلدی تمام کیا جائے۔

اِس پنجرے سے تھوڑی دور ایک ایسا پنجرہ آیا۔ جس پر لکھا ہوا تھا۔ "خطرہ" فرشتے کے ساتھی نے پنجرے کے قریب جانا چاہا۔ مگر اُس کے ساتھی نے اُسے پیچھے کھینچتے ہوئے کہا۔ "اس پنجرے سے دُور رہیئے۔ اِس میں ناپاک بندر قید ہیں۔ فرشتے کے ساتھی نے حیرانی سے کہا۔ "ناپاک بندر!" فرشتے نے جواب دیا۔ "ان بندروں کو چھونے سے معزز بندر ناپاک ہو جاتے ہیں۔ اِس لئے انہیں ایک علیحدہ پنجرے میں بند کیا گیا ہے۔ یہ بندر اتنے خطرناک ہیں۔ کہ اگر اُن کا سایہ بھی کسی معزز بندر پر پڑ جائے۔ تو وہ ناپاک ہو جائیگا۔" فرشتے کے ساتھی نے پوچھا۔ "یہ بندر شکل و صورت میں تو بالکل معزز بندروں کی طرح ہیں۔ پھر انہیں ناپاک کیوں قرار دیا گیا ہے۔" فرشتے نے کہا۔ "تم ابھی اس چڑیا گھر کی بوالعجبیوں کا ذکر کر رہے تھے سمجھ لو۔ یہ بھی ایک بوالعجبی ہے"

اس سے آگے ایک پنجرہ آیا۔ جس کے وسط میں ایک چھوٹی سی مصنوعی پہاڑی تھی۔ پہاڑی کے اُوپر روشنی کا ایک خوبصورت مینار بنا ہوا تھا۔ اس مینار کو پہنچنے

کے لئے متعدد راستے تھے۔ پنجرے کے جانور ان مختلف راستوں پر چلتے ہوئے مینار تک پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر عجیب بات یہ تھی۔ کہ اگرچہ تمام راستے مینار کے پاس آ کر مل جاتے تھے۔ تاہم سب جانور اس بات پر جھگڑ رہے تھے۔ کہ کونسا راستہ اچھا ہے۔ اور کونسا بُرا۔ حقیقت یہ تھی۔ کہ تمام راستے ایک دوسرے کے بالکل مشابہ تھے۔ فرشتے کے ساتھی نے دیکھا۔ کہ پہاڑی پر چڑھنے کی بجائے یہ سب جانور آپس میں جھگڑ رہے ہیں۔ فرشتے نے آہستہ سے اپنے ساتھی کے کان میں کہا۔ "اگر یہ جانور لڑنا جھگڑنا بند کر دیں۔ تو شاید مینار تک پہنچ جائیں۔"

اب صرف ایک پنجرہ باقی رہ گیا تھا۔ فرشتہ نے کہا۔ "آؤ لگے ہاتھوں اسے بھی دیکھ لیں" دونوں اس پنجرے کے پاس آئے اور ایک عجیب نظارہ دیکھا۔ ایک دم کٹا بندر پنجرے میں ٹانگوں کے بل کھڑا ہوا تھا۔ اُس کے پاس ایک تھیلا تھا۔ جس میں روٹیاں اور بھنی ہوئی مچھلیاں تھیں۔ اس تھیلے سے وہ ایک روٹی نکالتا۔ اور پنجرے میں رہنے والے کتوں کو دکھاتا۔ کچھ کتے اُس کے قریب آتے۔ اور خوب دُم ہلا ہلا کر اپنی محبت کا ثبوت دیتے۔ چند اُس کے قدموں پر لوٹ پوٹ ہو جاتے۔ کچھ اُس کے گرد ناچنا شروع کر دیتے۔ اس پر وہ بندر ایک آدھ ٹکڑا یا بھنی ہوئی مچھلی اُن کی طرف پھینک دیتا۔

باقی کتے یہ دیکھ کر شور مچاتے اور کہتے۔ "یہ بندر ان کتوں کے ساتھ زیادہ مہربانی سے پیش آتا ہے۔" اس پر وہ بندر چیخ کر کہتا۔ "تم بھی دُم ہلاؤ۔ تمہیں بھی روٹیاں اور مچھلیاں ملیں گی۔" وہ کتے زور زور سے دُم ہلانا شروع کرتے۔ تب کتوں کی پہلی جماعت بھونکنے لگتی اور کہتی۔ "ہم ان کتوں سے زیادہ زور کے ساتھ

دُم ہلا سکتے ہیں۔ روٹیاں اور مچھلیاں ہمیں ملنی چاہئیں۔" وہ چالاک بندر اُنکی پیٹھ ٹھونکتے ہوئے کہتا۔ "شاباش نمک حلال کتو۔ شاباش" اور اُن پر روٹیوں اور مچھلیوں کی بارش کر دیتا۔

فرشتہ اور اُس کا ساتھی بہت دیر تک اِس نظارے سے محظوظ ہوتے رہے آخر فرشتے کے ساتھی نے کہا۔ "عجیب جانور ہیں۔"

فرشتے نے جواب دیا۔ "نہایت عجیب۔"

دفعتاً گھڑی نے چار بجائے۔ اور فرشتہ اور اُس کا ساتھی پھر فضا میں پرواز کرنے لگے۔

شیشہ و تیشہ

(مضامینِ طنز و مزاح)

کنہیا لال کپور

فلمی شاہکار

آج میں بہت خوش ہوں۔ کیونکہ ابھی ابھی ایک مشہور فلم کمپنی کے ڈائرکٹر نے مجھ سے فرمائش کی ہے۔ کہ میں اُس کی تازہ فلم کے لئے کہانی لکھوں۔ شرائط یہ ہیں (۱) پلاٹ طبعزاد ہو (۲) عوام اسے پسند کریں۔ جہاں تک دوسری شرط کا تعلق ہے۔ اسے پُورا کرنا کوئی زیادہ مشکل نہیں۔ کون نہیں جانتا۔ عوام کیا پسند کرتے ہیں چند خوبصورت لڑکیاں (اگر نیم برہنہ ہوں تو سبحان اللہ) دس بارہ گانے۔ چار پانچ ناچ۔ اور آخر میں ہیرو اور ہیروین کی شادی۔ یہ ہے عوام کا مطالبہ۔ اور اگر اس مرکب میں بھونڈے مذاق کا عنصر بھی شامل کر دیا جائے۔ تو کیا کہنے۔ بلاشبہ آپ یہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ فلم نیا ریکارڈ قائم کرے گی۔ مگر پہلی شرط کو پُورا کرنا ذرا ٹیڑھی کھیر ہے۔ تاہم کوشش کرتا ہوں۔

میرے خیال میں اب لوگ ایسی فلموں سے تنگ آگئے ہیں۔ جن کا پلاٹ "محبت کی تکون" (Eternal Triangle) پر مبنی ہوتا ہے۔ دو مرد ایک عورت۔ دو عورتیں ایک مرد۔ یقیناً یہ داستان متعدد بار دُہرائی جا چکی ہے کیوں نہ ایسی کہانی لکھی جائے جس کا پلاٹ محبت کی کثیر الاضلاع (Eternal Polygon) پر مبنی ہو۔ مثلاً بیس اشخاص منتخب کئے جائیں۔ دس آدمی۔ دس عورتیں اور پھر اُن کو ایک دوسرے سے اس طرح عشق کرتے ہوئے دکھایا جائے۔ کہ اگر رشی کو لیلا سے محبت ہے۔ تو لیلا سرش پر فریفتہ ہے۔ سریش کملا کی محبت کا دم بھرتا ہے۔ تو کملا سریندر پر دل و جان سے فدا ہے۔ سریندر کو سروج سے عشق ہے۔ تو سروج مہندر کے دامِ اُلفت میں گرفتار ہے۔ اور بیچارہ مہندر مدت سے شیلا کے تیرِ نظر کا شکار ہو چکا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس اس زنجیر کے حلقے پھیلتے جائیں خاتمہ سے پہلے آدھے افراد خودکشی کر لیں۔ اور باقی ایک دوسرے کا سر پھوڑنے کے بعد جیل خانے پہنچ جائیں۔ کہانی کا پس منظر ہو ایسا کالج جہاں مخلوط تعلیم کا رواج ہے۔ اور کرداروں میں طالب علموں کے علاوہ دو چار پروفیسر بھی شامل کئے جائیں۔ تاکہ قصہ ناقابلِ یقین اور غیر دلچسپ معلوم نہ ہو۔ خودکشی کرنے والے حضرات اگر کالج کے کلاک ٹاور سے چھلانگیں لگائیں تو بہتر رہے گا۔ یہ اسلئے کہ باقی طالب علم اُن کی جرأتِ رندانہ یا لغزشِ مستانہ کی داد دے سکیں۔

میری دانست میں یہ پلاٹ طبعزاد ہے۔ کم از کم میں نے تو آج تک اس قسم کا پلاٹ ہندوستانی سکرین پر نہیں دیکھا۔ زیادہ سے زیادہ ہمارے ڈائریکٹر "محبت کی مستطیل" تک پہنچے ہیں۔ مگر "محبت کی کثیر الاضلاع" کے مقابلہ میں محبت

کی مستطیل' کی کیا وقعت ہے۔ اس پلاٹ میں البتہ ایک نقص ہے۔ وہ یہ کہ ایسے فلمانے کے لئے کم از کم بیس فلم سٹاروں کی خدمات حاصل کرنا پڑیں گی۔ اور ہندوستان میں بیس فلم سٹاروں کا ملنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ اس لئے بات نہیں بنیگی۔

اچھا تو کیوں نہ ایسا پلاٹ ایجاد کیا جائے۔ جو نفرت کی تکون' پر مبنی ہو۔ مثلاً مسٹر الف کو مس ب سے نگاہ اولین میں نفرت ہو جاتی ہے۔ شاید بیچاری کا رنگ کالا ہے۔ یا ناک چپٹی۔ مس ب بھی نفرت کا جواب نفرت میں دیتی ہے۔ رفتہ رفتہ یہ نفرت پروان چڑھنے لگتی ہے۔ پہلے وہ دو نوجیت ایک دوسرے کو ملتے تھے تو صرف منہ پھیر لیتے تھے۔ اب ایک دوسرے کو زیر لب گالیاں دیتے ہیں اور کچھ عرصہ کے بعد تو یہ حالت ہو جاتی ہے۔ کہ مس ب کو مسٹر الف کا نام سنکر متلی ہوتی ہے۔ اس اثنا میں ایک رقیب مسٹر ج' مسٹر الف کی نفرت کی راہ میں حائل ہوتا ہے۔ یہ شخص مس ب کو مسٹر الف سے بھی زیادہ نفرت کرتا ہے۔

اس کے بعد 'الف اور ج' کی لڑائی دکھائی جا سکتی ہے۔ بہت سی کرسیاں اور چند آئینے توڑے جا سکتے ہیں۔ ج کو جیل میں بھیجا جا سکتا ہے۔ اس سے قبل 'کمرہ عدالت' کا مقبول سین بھی دکھایا جا سکتا ہے۔ اور آخر میں اگر فلم کو المیہ بنانا منظور ہو۔ تو الف اور ب کی شادی۔ اگر طربیہ تو الف اور ب کی دائمی مفارقت۔

پلاٹ اچھا ہے لیکن قیاس غالب ہے۔ کہ کہانی مقبول عام نہیں ہو گی کیونکہ عوام سکرین پر صرف محبت کے سین دیکھنا پسند کرتے ہیں۔

کیا یہ بہتر نہ ہو گا۔ کہ ایسا پلاٹ ایجاد کروں۔ جو سنسنی خیز واقعات (Sensational Stunts) سے بھرپور ہو۔ سنا ہے۔ سٹنٹ فلم تجارتی

نقطہ نگاہ سے ہمیشہ کامیاب ثابت ہوتے ہیں۔ نام ہو "ڈاکو کا بیٹا" عرف "قاتل کا قاتل"۔ اور سٹنٹ ہوں ایسے کہ رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔

ایک ڈاکو اپنے باپ کے قاتل کو قتل کرنے کے بعد پولیس کے خوف سے مکان کی ساتویں منزل سے اس طرح بھاگتی ہوئی ٹریم کار پر چھلانگ لگائے کہ چوٹ کا تو کیا کہنا اُسے ہلکی سی خراش تک نہ آئے۔ ٹریم سے کود کر نہایت صفائی سے یکے میں آگرے۔ یکے سے پھدک کر یکے میں جتتے ہوئے گھوڑے پر جا بیٹھے۔ اور گھوڑے سے اُچھل کر جھیل میں جا پڑے۔ جب تیرتے تیرتے تھک جائے تو جھیل سے باہر نکل کر کسی اجنبی کے موٹر سائیکل پر سوار ہو جائے۔ اور ایک سو پچاس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے کسی پہاڑی پر چڑھنا شروع کر دے۔ اس اثنا میں چالاک پولیس افسر ہوائی جہاز میں بیٹھ کر ڈاکو کا تعاقب کرے اور ہوائی چھتری کی مدد سے دھم سے موٹر بائیسکل کی سائیڈ کار میں آن گرے۔ اور جھٹ پستول کو نکال کر کہے: ہینڈز اپ (Hands up) وغیرہ وغیرہ۔

یہ پلاٹ مقبول عام تو ہو سکتا ہے۔ مگر شاید طبعزاد نہیں۔ اس میں اگر کوئی جدت ہے۔ تو صرف یہی کہ پولیس افسر کو ہوائی چھتری کی مدد سے اُترتے دکھایا گیا ہے۔

ذرا ٹھہریئے۔ کیوں نہ ایسی کہانی لکھی جائے۔ جو کسی سنت اوتار یا سادھو کی زندگی کے متعلق ہو۔ جیسے "سنت طوطا رام" "سوامی بھوت ناتھ"۔ "بھگت ڈرپن داس"۔ کم از کم عورتیں اور بوڑھے آدمی تو ایسی فلم کو بے حد پسند کریں گے۔ سنت طوطا رام کو لنگوٹا بندھوا کر کسی بڑھ یا پیپل کے درخت کے نیچے بٹھا

دیا جائے۔ چار پانچ منٹ سمادھی لگانے کے بعد وہ ایک لمبے چوڑے گرنتھ سے جو کاغذ کی بجائے پیپل کے پتوں پر لکھا گیا ہے چند نہایت عامیانہ قسم کی باتیں ترنم کے ساتھ لوگوں کو پڑھ کر سنائیں۔ جیسے "مرنے کے لئے ہر وقت تیار رہو۔ بلکہ ہو سکے تو زندہ رہنے کی کوشش ہی مت کرو۔" اپنے ہمسائے کی بیوی کو اپنی بہن سمجھو۔" "جانوروں پر رحم کھاؤ۔ لیکن پیاز مت کھاؤ۔" اس کے بعد سنت جی دو ایک معجزے دکھائیں۔ مثلاً ایسا منتر پڑھیں۔ کہ اُن کے تمام دشمن اندھے ہو جائیں۔ یا اس قسم کا فلک شگاف نعرہ بلند کریں۔ کہ ہر ایک گھر کو آگ لگ جائے۔ ریت سے پھول اُگنے لگیں۔ لوگ پاگل ہو جائیں۔ بھلے چنگے انسان سنت صاحب کی مہربانی سے لنگڑے ہو جائیں۔ اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہے۔ جب تک سنت جی کے مخالف راہِ راست پر نہیں آتے۔ یعنی اُن کا لوہا نہیں مانتے۔ اس کے بعد سنت جی کی موت کا سین دکھایا جائے۔ سنت جی دم توڑنے کے بعد ہوا میں اُڑتے ہوئے نظر آئیں۔ ہو سکے تو اُن کیلئے عرش بریں سے کوئی رتھ یا اُڑن کھٹولا بھی بھیجا جائے۔ جب آپ اُڑن کھٹولے میں اطمینان کے ساتھ سوار ہو جائیں۔ تو اُن پر پھولوں کی بارش کی جائے۔

میری رائے میں یہ پلاٹ، ڈائریکٹر صاحب ضرور پسند فرمائیں گے یقیناً یہ طبعزاد نہیں۔ لیکن اس میں مقبولیت عامہ حاصل کرنے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے۔ اور دراصل ڈائریکٹر لوگ چاہتے بھی یہی ہیں۔ سنت طوطا رام کے نام میں ہی وہ کشش ہے۔ کہ لوگ کھنچے چلے آئیں گے۔ اور پھر جب اُن کے معجزے سکرین پر دکھائے جائیں گے۔ تو ہال تالیوں کی آواز سے گونج اُٹھے گا۔ مگر

سب سے بڑی خوبی اِس پلاٹ میں یہ ہے۔ کہ یہ فلم ہر ایک باپ اپنی بیٹی کے ساتھ بیٹھ کر دیکھ سکے گا۔ اور اگر بہن اپنے بھائی کی معیت میں اس سے لطف اندوز ہونا چاہے گی۔ تو بھائی کو شرم سے گردن جھکانا نہیں پڑے گی۔

لیجیے صاحب تو ڈائریکٹر ایف۔ زیڈ۔ کامرانی کی تازہ فلم کے لئے کہانی تیار ہو گئی۔ عنقریب اپنے شہر کی دیواروں پر یہ پوسٹر چھپے گا۔ ڈائریکٹر کامرانی کا نیا شاہکار سنت طوطا رام ..... کہانی۔ پروفیسر کے۔ ایل کپور ..... مکالمے ماسٹر ہُد ہُد!"

اچھا ادب

میں نے ابھی ابھی "جدید ادب" کے موضوع پر ایک محترمہ کا پُرمغز مقالہ پڑھا ہے۔ اپنے مقالے کے آخر میں محترمہ فرماتی ہیں۔ کہ اگرچہ اردو زبان میں بڑے اچھے افسانہ نگار ہیں۔ لیکن ابھی تک ہندوستان میں کوئی موپاساں، چیکوف یا گورکی پیدا نہیں ہوا۔ بات فکر کی ہے۔ اور میں اس مسئلہ پر غور کر رہا ہوں۔ دو ایک وجہ میری سمجھ میں آتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہندوستان نے اسلئے کوئی موپاساں پیدا نہیں کیا۔ کیونکہ ہندوستان فرانس نہیں۔ دوسری وجہ ہندوستانی موپاساں کے پیدا ہونے کی یہ معلوم ہوتی ہے۔ کہ بہت سے لکھنے والے موپاساں اور چیکوف بننے کی بجائے ان کی کہانیوں کے چربے اُتارنے کی فکر میں رہے ہیں۔ مگر یہ دونوں وجوہ ناکافی سی معلوم ہوتی ہیں۔ میں ابھی اس مسئلہ پر مزید غور کر رہا ہوں کہ میرے دوست ششی موہن کمرے میں داخل ہوتے ہیں۔ میں اُن کی رائے دریافت کرتا

ہوں۔ منشی موہن انتہا پسند نقاد واقع ہوئے ہیں۔ اُن کے خیال میں میری دو نو وجوہ سر بسر غلط ہیں۔ ان کی دانست میں اُردو ادب دَور انحطاط میں سے گذر رہا ہے۔ اور سب سے بڑی بدقسمتی یہ نہیں۔ کہ گھٹیا ادیب پیدا ہو رہے ہیں۔ بلکہ یہ کہ اچھے ادیب گھٹیا قسم کا ادب پیدا کر رہے ہیں۔ اس لئے اُن کی پہلی تجویز یہ ہے کہ گھٹیا ادب کی روک تھام کے لئے ایک انجمن قائم کی جائے۔ جس کا نام ہو۔ "ادبی کورٹ مارشل"۔

اس انجمن کے تین شعبے ہوں۔ (۱) شعبہ تفتیش۔ (۲) شعبہ سرزنش و تنبیہ۔ (۳) شعبہ سزا۔

شعبہ تفتیش کے ذمے یہ کام ہو۔ کہ ہر ادیب کی ادبی تخلیقات پر کڑی نگاہ رکھے۔ اور جب کوئی ادیب موپاساں چیکوف یا گورکی سے پلاٹ یا افسانے کا مرکزی خیال چراتا ہوا دیکھے۔ اِس سرقے کو فوراً منظرِ عام پر لائے۔ ظاہر ہے۔ اس محکمہ کو بہت کاوش کرنا پڑے گی۔ یہ بھی ظاہر ہے۔ کہ درجنوں ادبا کو لکھنا بند کرنا پڑے گا۔ کیونکہ سرقہ کے بغیر وہ کیسے لکھ سکیں گے۔ اس طرح اُن ادبا کی چھانٹ ہو جائیگی۔ جو دوسروں کی کہانیوں کو مقامی رنگ دیکر اپنی طبعزاد تخلیقات ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

محکمہ سرزنش و تنبیہ کا یہ کام ہو گا۔ کہ جب کسی ادیب کو بلند معیار سے گرتے ہوئے دیکھے۔ اُسے متنبہ کر دے۔ یا جب یہ دیکھے کہ کوئی خود پسند ادیب ایسی حرکت کا مرتکب ہو رہا ہے جس سے اُردو ادب کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہے۔ تو اُسے بروقت آگاہ کر کے اردو ادب کو بچانے کی کوشش کرے۔ اِس محکمے کے نوٹس

جو ادبا کو وقتاً فوقتاً بھیجے جائیں۔ کچھ اس قسم کے ہوں :-

معمولی تنبیہ :- تم اچھے شاعر ہو۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم اچھے افسانے بھی لکھ سکتے ہو۔

سخت تنبیہ :- یہ افسانہ لکھا ہے۔ یا جھک ماری ہے۔

سرزنش :- تمہارا دماغ افسانہ کے لئے رسا نہیں۔ خواہ مخواہ ہر صنف کے پیچھے ہیں ٹانگ مت اڑاؤ۔

سخت سرزنش :- خدا کے لئے افسانے لکھنے بند کرو۔

ساتھ ہی یہ محکمہ یہ بھی دیکھے۔ کہ کونسے ادیب کو زیادہ لکھنے کی ضرورت ہے اور کون سے ادیب کو کم لکھنے کی۔ چنانچہ اگر ایک اچھے ادیب کے لکھنے کی رفتار بہت سست ہے۔ تو اُسے فوراً مطلع کیا جائے۔ اور اگر ہو سکے۔ تو کاغذ۔ قلم دوات دے کر اُسے ایک کمرے میں بند کر دیا جائے۔ اور تب تک باہر نہ نکالا جائے۔ جب تک وہ ایک آدھ درجن شاہکار افسانے لکھ کر نہ دکھائے۔ برعکس اس کے اگر کسی ادیب کو زیادہ لکھنے کا مرض ہو گیا ہے۔ تو اُسے معین عرصہ کے لئے کچھ نہ لکھنے کی فہمائش کی جائے۔

محکمہ سزا کے فرائض یہ ہوں۔ کہ جو ادیب باوجود تنبیہ اور سرزنش کے گھٹیا قسم کی چیزیں لکھے۔ اُسے قرار واقعی سزا دی جائے۔ سزا کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں مثلاً ادیب کو سنگسار کرنا۔ اُس کی کتابوں کو چوک میں رکھ کر آگ لگا دینا۔ رسائل کے ایڈیٹروں اور کتابوں کے ناشروں کو مطلع کرنا۔ کہ اُس ادیب کی کوئی چیز شائع نہ کریں۔ البتہ اگر آل انڈیا ریڈیو چاہے۔ تو اُس ادیب کے ادبی کارناموں کو نشر

کرلے۔ششی موہن یہ بھی کہتے ہیں۔کہ ڈھیٹ قسم کے ادباکو کوڑے بھی لگوائے جائیں گو یہ طریقہ بیحد مؤثر اور مفید ثابت ہوسکتا ہے مگر مجھے اِس سے اتفاق نہیں۔

ششی موہن کی دوسری اہم تجویز یہ ہے۔کہ شاہکار افسانوں کو معرضِ وجود میں لانے کے لیئے انفرادی کوشش کی بجائے اجتماعی کوشش کی جائے۔اُن کا نظریہ ہے۔کہ اچھا آرٹ اجتماعی کوششوں کا نتیجہ ہوتا ہے۔مثال کے طور پر وہ تاج محل اور اجنتا کی تصاویر پیش کرتے ہیں۔اُن کے خیال میں تاج محل کی تخلیق میں شاہجہان کے تخیل کے علاوہ ہزاروں انجنیئروں اور معماروں کا ہاتھ ہے۔اسی طرح اجنتا کی تصاویر صرف ایک آرٹسٹ کی جدتِ طبع کی مرہونِ منت نہیں ہوسکتیں چنانچہ اگر ہم انفرادی طور پر فرانسیسی یا روسی شاہکاروں کی گرد کو نہیں پہنچ سکے۔تو ہمیں اجتماعی طور پر اُنکی ہمسری کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ششی موہن صاحب کی رائے میں ایک اچھا افسانہ ایک اچھی فلم کی طرح بہت سے آرٹسٹوں کے غور و فکر کا نتیجہ ہونا چاہیئے۔مثلاً ایک صاحب افسانے کا نام تجویز کریں۔دوسرے صاحب اُس کا مرکزی خیال۔افسانے کی زبان اور گرامر کے تیسرے صاحب انچارج ہوں تشبیہیں اور استعارے چوتھے آرٹسٹ کے ذمے لگائی جائیں۔پانچواں ادیب روزمرہ اور محاورہ وغیرہ کی صحت کا خیال رکھے۔مطلب یہ کہ جہاں آجکل کئی افسانوں کا صرف ایک مصنف ہوتا ہے۔وہاں ایک افسانے کے متعدد مصنفین ہوں۔ اور افسانے کے شروع میں اُن سب کا نام آئے۔مثلاً :-

نام	دیویندر ستیارتھی
مرکزی خیال	راجندر سنگھ بیدی

زبان اور گرامر   مولانا صلاح الدین احمد
تشبیہیں اور استعارے   کرشن چندر
روزمرہ اور محاورہ   چراغ حسن حسرت

اس طرح ایک ایسا افسانہ تیار کیا جائے۔ جسے افسانوں کی دنیا میں 'تاج محل' کا خطاب دیا جا سکے۔

منشی موہن اپنی تقریر ختم کر کے اب اپنا سگار سلگا رہے ہیں۔ اور میں دل ہی دل میں سوچ رہا ہوں۔ کتنا بیوقوف ہے یہ منشی موہن۔ بیوقوف اور سادہ لوح یہ اتنا بھی نہیں جانتا۔ کہ اچھا ادب کبھی قانون کے زور سے پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ اور جب "وقت" کہ دنیا کا سب سے بڑا اور سب سے ذہین نقاد ہے ہمارے پاس موجود ہے۔ تو ہمیں ادبی کورٹ مارشل کی کیا ضرورت ہے...... میں بدستور سوچ رہا ہوں منشی سگار کے کش لگا رہا ہے۔ مگر اس اثنا میں محترمہ کے سوال کا کوئی خاطر خواہ جواب میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ ہندوستان نے کیوں آج تک موپاساں چیکوف یا گورکی پیدا نہیں کیا۔

شیشہ و تیشہ

(مضامینِ طنز و مزاح)

کنہیا لال کپور

شیشہ و تیشہ

(جناب ہمزاد حزیں اپنے کمرے میں ٹہل رہے ہیں۔ بال بکھرے ہوئے ڈاڑھی لمبی سی۔ سرمئی آنکھیں جن سے ایک نورانی چمک ہویدا ہے عمر لگ بھگ پنتالیس سال حلیہ کسی واعظ سے ملتا جلتا۔ مگر قد و قامت کے اعتبار سے چمڑے کے سوداگر نظر آتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ دماغ کو آزمائش میں ڈال رکھا ہے۔ کیا سوچ رہے ہیں؟ شاید کسی شعر کا دوسرا مصرع۔ کسی غزل کا مقطع۔ کوئی نیا گیت۔ کچھ دیر بعد آہستہ آہستہ گنگناتے ہیں)

ہمزاد:۔ آج مجھ سا نہیں زمانے میں۔ شاعر نغز گوئے خوش گفتار (شعر کو تین بار دہرانے کے بعد) آج میں اقلیم سخن کا بادشاہ ہوں۔ کم وبیش تمام

شاعر میرے آگے زانوئے ادب تہہ کرتے ہیں (وقفہ کے بعد) مگر آج ہندوستان میں شاعر ہیں کہاں۔ دہلی اور دکن میں تو کوئی سخن گو ہی نہیں اور پنجاب میں یہی تین چوتھائی۔ یعنی نصف حفیظ جالندھری اور ایک چوتھائی اختر شیرانی۔ لکھنؤ میں مجاز اور ملیح آباد میں جوش ہے۔ مگر یہ دونو اشتراکی ٹھہرے۔ مجھے کلام ہے کہ انہیں شاعر کہا بھی جا سکتا ہے یا نہیں (لمبی سانس لے کر) ۔ آج مجھ سا نہیں زمانے میں۔

نوکر:۔ حضور، نجمی خیرآبادی ملاقات کے لئے حاضر ہوئی ہیں۔

ہمزاد:۔ (چونک کر) کون؟..... نجمی خیرآبادی...... بڑے احترام کے ساتھ اوپر لے آؤ۔

(نوکر جاتا ہے)

ہمزاد:۔ (اپنے آپ سے) نجمی خیرآبادی..... نجمی خیرآبادی...... اُف کس قدر مٹھاس اور ترنم ہے اس نام میں۔

نجمی خیرآبادی:۔ (کمرے میں داخل ہوتی ہوئی) آداب عرض کرتی ہوں حضور۔

ہمزاد:۔ (مسکراتے ہوئے) آداب عرض، آداب عرض تشریف رکھیئے۔

نجمی خیرآبادی:۔ (کرسی پر بیٹھتے ہوئے) کہیئے حضور۔ ہندوستان کے شیریں مقال کا کیا حال ہے۔

ہمزاد:۔ آپ کی دعا ہے...... (وقفہ کے بعد) اور جانِ نغمہ کے مزاج کیسے ہیں؟

نجمی خیرآبادی:۔ جانِ نغمہ!

ہمزاد :- ہاں ہاں آپ کے سوا یہ لحن داؤدی کسے نصیب ہے۔

نجمی خیرآبادی :- (انکساری ظاہر کرتی ہوئی) ذرہ نوازی کا بہت بہت شکریہ آپ کی ہی غزلوں اور گیتوں نے میرا نام روشن کیا۔ ورنہ ناچیز کس لائق تھی۔

ہمزاد :- سچ تو یہ ہے کہ تمہارے نور کے سانچے میں ڈھلے ہوئے گلے نے میری غزلوں اور گیتوں میں ترنم بھر دیا۔

نجمی خیرآبادی :- تو یہ تو ہے۔ یہ گانا ہی کس کام۔ نہ بات کرنے کا سلیقہ۔ نہ . . . . .

(دونوں ہنستے ہیں)

ہمزاد :- (نجمی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے) نجمی یاد ہے۔ وہ دن جب میں نے تمہیں اپنا پہلا گیت گانے کو دیا تھا۔ کیا تھا پہلا بند ؎

مان لے سجنی میری بات

اب تو بیت چلی برسات

نجمی :- خوب یاد آیا۔ ہز ماسٹرز وائس کے اس ریکارڈ نے تو گذشتہ سب ریکارڈ توڑ دیئے تھے۔ کمپنی کے مالک دانتوں میں انگلی دبائے پھرتے تھے۔

ہمزاد :- اور وہ نظم ؎

تم نے ہماری بات نہ مانی۔ ہائے شریفہ۔ ہائے نصیبن

خاک تمہارے در کی بھی چھانی۔ ہائے شریفہ۔ ہائے نصیبن

نجمی خیرآبادی :- ہاں اور اس میں وہ لافانی شعر ؎

آنکھوں سے اب خون رواں ہے۔ غور سے دیکھو خون کہاں ہے

خون نہیں ہے۔ ہے یہ پانی۔ ہائے شریفہ۔ ہائے نصیبن

ہمزاد:- یہ نظم میرے جواں سال تخیل کی یادگار رہے گی ؎
اب طبیعت میں وہ اُبال کہاں

نجمی:- ہاں اب آپ کو گیت لکھنے کا شوق چرایا ہے اور بخدا گیت لکھنے میں تو آپ کو کمال حاصل ہے۔

ہمزاد:- غزل کے دو چار شعر چُست کر لینا کوئی بڑی بات نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ پہلے میں بے معنیٰ غزلیں کہتا تھا۔ اور اب بے معنیٰ گیت لکھتا ہوں۔ تم نے "نغمۂ حور" تو پڑھا ہی ہے۔

نجمی:- جی ہاں۔ اور "نالۂ بجور، درد مہجور، موجِ بجور" بھی۔

ہمزاد:- پسند آئیں۔

نجمی:- (مسکرا کر) یہ بھی ایک ہی کہی۔ ان میں شاید ہی کوئی گیت ہوگا۔ جو میں نے کسی نہ کسی فلم کمپنی کے لئے نہیں گایا۔

ہمزاد:- نجمی میں تمہارا کس قدر احسان مند ہوں۔

نجمی:- اجی اتنی انکساری بھی کیا......

ہمزاد:- میں کبھی سوچتا ہوں کہ اگرچہ میں نے اپنا کلام محفوظ رکھنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ پھر بھی خدا کا شکر ہے کہ تمہاری اور ہز ماسٹرز وائس کمپنی کی وساطت سے میرا کلام آنے والی نسلوں تک پہنچ ہی جائیگا۔

نجمی:- اور فلموں کو تو آپ بھول ہی گئے۔

ہمزاد:- اوہ۔

نجمی:- باتوں باتوں میں اصلی بات کھو ہی گئی۔ حضور کو یاد ہوگا کہ آپ نے مجھے اپنی

"تازہ غزل ریکارڈ کرنے کے لئے عطا کرنے کا وعدہ فرمایا تھا۔

ہمزاد:۔ ہاں وہ غزل تیار ہے۔

نجمی:۔ ارشاد۔

ہمزاد:۔ وہ غزل میرے دماغ میں محفوظ ہے۔ تم جانتی ہو کہ میں نے کبھی اپنا کلام بیاض میں نہیں لکھا۔

نجمی:۔ ارشاد۔ ارشاد۔

ہمزاد:۔ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ میں گاتا جاؤں اور تم لکھتی جاؤ۔
(ہارمونیم پر گاتے ہوئے) ؎

اک بے حیا سے پیار کیا۔ ہائے کیا کیا
اُس کو گلے کا ہار کیا۔ ہائے کیا کیا

نجمی:۔ واللہ۔ کیا طرز نکالی ہے۔ واہ۔ واہ۔ واہ۔ واہ۔

ہمزاد ؎ دامِ نظر فریب میں آئے نہ جب بٹیر
شعروں کا ہی شکار کیا۔ ہائے کیا کیا

نجمی:۔ کیا دُور کی سُوجھی ہے۔ مکرر فرمایئے حضور۔

(ہمزاد دوبارہ وہی شعر گاتا ہے)

ہمزاد ؎ پٹیا ہوں روز بیچ کے غزلوں کو شہر میں
شیوہ یہ اختیار کیا۔ ہائے کیا کیا

نجمی:۔ جزاک اللہ۔ کیا جلا بھنا شعر ہے۔

ہمزاد:۔ مقطع عرض ہے ؎

اللہ رے مذاقِ جنوں ان کو دیکھ کر
اپنے ہی دل پہ وار کیا، ہائے کیا کیا

نجمی:۔ (خوشی سے ناچتے ہوئے) اعجاز ہے اعجاز۔ کیا تیور ہیں اس شعر کے۔

ہمزاد:۔ آپ کی دعا ہے۔ ورنہ من آنم کہ من دانم۔

نجمی:۔ غزل کا بہت بہت شکریہ۔ اب اجازت چاہتی ہوں۔ انشاء اللہ اس منگل کو غزل کا ریکارڈ آپ کی خدمت میں پیش کروں گی۔

ہمزاد:۔ آخر جانے کی اتنی کیا جلدی ہے۔ ذرا بیٹھو، پیو، پلاؤ۔

نجمی:۔ شکریہ۔ میں پھر حاضر ہوں گی۔ مجھے ابھی سٹوڈیو میں ریہرسل کے لئے جانا ہے۔

ہمزاد:۔ بڑے مطلب پرست ہو۔

نجمی:۔ (اٹھتے ہوئے) خدا حافظ!

ہمزاد:۔ (بادلِ نخواستہ) خدا حافظ۔

(چلی جاتی ہے)

ہمزاد حزیں:۔ (اپنے آپ سے) کیا لوچ ہے اس کافر کی آواز میں مجھے یقین ہے جب میری غزل گائے گی حشر برپا کر دے گی۔

نوکر:۔ حضور، جبر مطلب آبادی تشریف لائے ہیں۔

ہمزاد:۔ احترام کے ساتھ اوپر لے آؤ۔

(جبر مطلب آبادی داخل ہوتے ہیں عمر تقریباً پچاس سال لباس اور چہرے سے پتہ چلتا ہے کہ لاابالی طبیعت کے مالک ہیں)

جبر مطلب آبادی:۔ السلام علیکم۔ ہمزاد بھائی۔

ہمزاد:۔ وعلیکم السلام۔ آئیے جبر صاحب۔ آپ کی صورت کو تو آنکھیں ترس گئیں۔
جبر مطلب آبادی:۔ میری صورت کو۔ اماں یار کیوں جھوٹ بولتے ہو۔ یوں کیوں نہیں کہتے نجمی خیرآبادی کی صورت کو۔
ہمزاد:۔ نجمی خیرآبادی۔ یادش بخیر۔ ابھی ابھی تشریف لے گئی ہیں۔
جبر مطلب آبادی:۔ وائے قسمت!

(ہمزاد مسکراتا ہے)

جبر مطلب آبادی:۔ بھئی ہمزاد، میں تم سے ایک مشورہ کرنے آیا ہوں۔
ہمزاد:۔ ارشاد۔
جبر:۔ (بیاض کھولتے ہوئے) میں نے ایک غزل کہی ہے۔ اس میں ایک شعر غور طلب ہے۔
ہمزاد:۔ فرمائیے۔ فرمائیے۔
جبر:۔ (بیاض سے پڑھتے ہوئے) ؎

تمہارے چہرے سے جس وقت کہ نقاب اُٹھا
تمام بندے پکارے کہ آفتاب اُٹھا

ہمزاد:۔ آفتاب اُٹھا؟ بھئی یہ محاورہ ......
جبر:۔ یعنی غیر فصیح ہے۔ مگر میں اپنا خوبصورت شعر ضائع نہیں کرنا چاہتا۔
ہمزاد:۔ تو رہنے دیجئے۔ یہاں بال کی کھال اتارنے والا کون ہے۔ سخن گو تو اک طرف سخن فہم بھی کہیں نظر نہیں آتا۔
جبر:۔ ایک لحاظ سے یہ محاورہ درست بھی ہے۔ ایک نکتہ سنج انگریزی دان دوست

نے مجھے بتایا کہ انگریزی میں (The sun Rose) کہا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے اُردو میں آفتاب اُٹھنا، کوئی خاص بُرا معلوم نہیں ہوتا۔

ہمزاد:۔ اور اگر انگریزی میں ٹھیک ہے تو اُردو میں بھی یہ محاورہ مستعمل قرار دیا جا سکتا ہے۔

جبر:۔ شکریہ، آپ نے میرے تمام شکوک رفع کر دیئے۔

ہمزاد:۔ یہ تو کہیئے کہ کوئی نئی چیز کہی آپ نے؟

جبر:۔ خاص نئی تو نہیں۔ خیال تو پُرانا ہی ہے۔ البتہ زمین ضرور نئی ہے۔

ہمزاد:۔ ارشاد۔

جبر:۔ عرض کیا ہے ؎

واہ کیا تیری شان ہے پیاری
سب پہ تو مہربان ہے پیاری

ہمزاد:۔ سبحان اللہ۔ کیا کرارہ مطلع ہے۔

جبر: ؎ مجھ سے کیوں بدگمان ہے پیاری
جب کہ تو میری جان ہے پیاری

ہمزاد:۔ اجی حضرت! یہ روئے سخن کس کی طرف ہے۔

جبر:۔ پہلے غزل تو سُن لیجئے۔ عرض کیا ہے ؎

ہے مری شکل سے تجھے نفرت
یا مرے زر کا دھیان ہے پیاری

ہمزاد:۔ واللہ! خوب چوٹ کی ہے!

جبر:۔ ؎ میری آنکھیں ہیں میرے چہرے پر

اور منہ میں زبان ہے پیاری

ہمزاد:۔ (جبر کی پیٹھ ٹھونک کر) یہ طلسم کاری ہے۔ شعر نہیں سحر ہے سحر۔

جبر:۔ آداب عرض۔ شعر ہے ؎

دیکھ چہرے کی جھریوں کو نہ دیکھ

میرا دل تو جوان ہے پیاری

ہمزاد:۔ شعر کیا ہے صاحب تصویر کھینچ دی۔

جبر:۔ مقطع عرض کرتا ہوں ؎

آکہ تجھ بن یہ جبو نپڑا میرا

بیکسی کا مکان ہے پیاری

ہمزاد:۔ (فرطِ محبت سے گلے لگا کر) جبر بھائی تغزل تم پر ختم ہے۔

نوکر:۔ جناب چند شریف زادیاں شرفِ نیاز حاصل کرنے کے لئے حاضر ہوئی ہیں

ہمزاد:۔ یہاں شریف زادیوں کا کیا کام ..... (وقفہ کے بعد) اچھا آنے دو۔

ہمزاد:۔ بھئی جبر، مجھے ایک گونہ مسرت ہے کہ میری شہرت بازارِ حسن سے نکل کر شریف گھرانوں تک جا پہنچی۔

(دروازہ کھلتا ہے۔ چند خواتین پاؤڈر میں نہائی ہوئی داخل ہوتی ہیں اور جھک کر آداب بجالاتی ہیں)

ہمزاد:۔ (گھبرا کر) آپ کی تعریف؟

خواتین میں سے ایک:۔ (مسکرا کر) بندی کو زہرہ جبین کہتے ہیں۔

دوسری :- اور کنیز کو ثریا کے نام سے پکارتے ہیں۔
تیسری :- اور میں ہوں شمیم اختر اور یہ ہیں ہماری سہیلیاں مشتری بیگم اور پری بانو۔
ہمزاد :- تشریف رکھئے۔ کیسے آنا ہوا۔
تمام :- (یک زبان ہوکر) بس دیدار کی ہوس کھینچ لائی۔
جبر :- (حاسدانہ لہجے میں) بھئی ہمزاد۔ خوش نصیب ہو تم۔ ایک میں ہوں کہ حسن مجازی کی تلاش میں آگرہ۔ لکھنؤ اور دلّی کی گلیوں میں مارا مارا پھرتا رہا ہوں اور ایک تم ہو کہ حسن تمہارے پیچھے پیچھے بھٹکتا پھرتا ہے۔
زہرہ جبیں :- حضور اگر طبع حزیں پر گراں نہ گذرے تو ایک بات عرض کردوں۔
ہمزاد :- ارشاد۔
زہرہ جبیں :- آپ از راہ کرم اپنی تازہ غزلیں ہمیں عنایت کریں۔
شمیم اختر :- اور وہ اس لیے کہ جب تک ہم آپ کی غزلیں نہ گائیں گی۔ ہماری قدر افزائی ممکن نہیں۔
ہمزاد :- کیا آپ کا یہ مطلب ہے کہ صرف اسی گانے والے کی قدر کی جاتی ہے۔ جو میری غزلیں اور گیت گائے۔
پری بانو :- یہ بالکل صحیح ہے سرکار۔ ہم میر۔ غالب۔ ذوق۔ ظفر کی غزلیں گا گاکر تھک گئیں۔ مگر کسی نے پوچھا تک نہیں۔
ہمزاد :- تعجب! معلوم ہوتا ہے کہ میر۔ غالب وغیرہم کے کلام کا جوبن ڈھل چکا ہے
جبر :- (سر ہلاکر) دریں چہ شک، آخر یہ طلسم ایک دن ٹوٹنا تھا۔
ہمزاد :- اچھا تو آپ کو گیت درکار ہے یا غزل۔

زہرہ جبیں: میرے خیال میں گیت ۔ ۔ ۔ ۔

ہمزاد:۔ اچھا تو سنئے۔

جبر:۔ میٹھے بول سنانے سے پہلے ذرا دو دو گھونٹ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ہمزاد:۔ ضرور ضرور، وہ رہی بوتل۔

جبر:۔ اور یہ رہے ساغر۔

زہرہ جبیں:۔ اور یہ رہا ساقی۔

(ساغر اور چوڑیاں کھنکھناتی ہیں۔ محفل کا رنگ بدلنے لگتا ہے)

جبر:۔ (نشے میں سرشار ہو کر) ؎ شاعر ہوں میں شاعر ہوں میرا ہی زمانہ ہے۔

ہمزاد ؎ فانی ہے نہ اصغر ہے تیرا ہی زمانہ ہے

جبر:۔ ؎ رونے کی تمنا ہے ہنسنے کا زمانہ ہے

ہمزاد:۔ ؎ آنا ہے نہ جانا ہے جانا ہے نہ آنا ہے

جبر:۔ ؎ اس نے ہمیں سمجھا ہے ہم نے اسے جانا ہے

ہمزاد:۔ ؎ ہم ٹانگ سے لنگڑے ہیں وہ آنکھ سے کانا ہے

زہرہ جبیں:۔ (سہیلیوں سے) کیا کہنے ہیں حضور کے (ہمزاد سے) اب گیت دیجیے نا!

ہمزاد:۔ بھائی جبر اجازت ہے؟

جبر:۔ ہاں ہاں شوق سے گیت سنائیے۔ مگر ذرا ترنم سے۔

ہمزاد:۔ (گاتے ہوئے)

سجنی کی ترچھی چتون ہے

سجنی کی لمبی گردن ہے

سجنی کے ہونٹوں پر لالی
سجنی کے کانوں میں بالی
سجنی کی زلفیں ہیں کالی
سجنی زہریلی ناگن ہے
سجنی کی ترچھی چتون ہے

شمیم اختر:۔ واہ واہ کتنا پیارا گیت ہے۔

ہمزاد:۔ سجنی کے ہیں لمبے گیسو
سجنی کے ہیں سندر ابرو
سجنی کے پاؤں میں گھنگرو
سجنی کرتی چھن چھن چھن ہے
سجنی کی ترچھی چتون ہے

(زہرہ بیبین اُٹھ کر ناچنے لگتی ہے)

ہمزاد سجنی میرے پاس نہیں ہے
ملنے کی بھی آس نہیں ہے
گیت ہے یہ بکواس نہیں ہے
مشکل سے آتا یہ فن ہے
سجنی کی ترچھی چتون ہے

نوکر:۔ جناب چند قوال درِ دولت پر حاضر ہوئے ہیں۔

ہمزاد:۔ کہدو، اس وقت فارغ نہیں پھر کسی وقت آئیں۔

جبر:۔ بلاؤ یار۔ لگے ہاتھوں ذرا قوالی بھی ہو جائے۔

(چند کالے کلوٹے ریاستی پگڑیاں باندھے داخل ہوتے ہیں)

قوال:۔ (بیک زبان) آداب عرض ہے جناب ہمزاد صاحب .... جناب جبر صاحب

جبر:۔ اوہو، یہ تو لکھنؤ کے مشہور قوال ہیں۔ انہیں پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ کہو بھئی کیا حال ہے۔

ایک قوال:۔ جناب کی نوازش ہے۔ اس جمعرات کو ریڈیو پر ہماری پارٹی کا گانا ہے کوئی تازہ چیز مرحمت فرمائیں۔

جبر:۔ میرے پاس تو کوئی نئی غزل تیار نہیں۔ آپ متاخرین کے کلام میں سے کوئی چیز پڑھ دیں۔

دوسرا قوال:۔ جناب ہم نے غالب کی ہر غزل کو قوالی کی طرز پر گایا ہے۔ اور اتنا گایا ہے کہ اُس کا حلیہ بگاڑ دیا ہے۔ ابھی گذشتہ ہفتہ ریڈیو پر اُن کا مشہور شعر گایا ہے۔ ؎

لازم تھا کہ دیکھو میرا رستہ کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور

جبر:۔ کچھ پسند کیا گیا؟

قوال:۔ جی بہت۔ خاص کر جب ہم تالیاں بجا بجا کر کہتے تھے۔ ہاں ہاں کوئی دن اور ...... اجی ہاں کوئی دن اور ..... واہ واہ کوئی دن اور .....

جبر:۔ اچھا تو اگر آپ کو یہ غزل دوں۔

قوال: ارشاد۔

جبیر:۔ کیا چیز ہے۔کیا چیز ہے، ظالم کی کمر بھی
چھینا ہے جس نے دل بھی مرا اور جگر بھی

قوال:۔ (خوشی سے) جناب یہ غزل تو سو فیصدی قوالی ہے۔

جبیر:۔ اچھا تو اسے نہ صرف ریڈیو پہ گاؤ۔ بلکہ ہر گلی کوچے اور بازار میں گاؤ۔

قوال:۔ بہت اچھا حضور (گاتے ہوئے نیچے اتر جاتے ہیں)

کیا چیز ہے، کیا چیز ہے ظالم کی کمر بھی

نوکر:۔ حضور۔ جناب آبرو لکھنوی اور شاکر نجومی تشریف لائے ہیں۔

ہمزاد اور جبیر:۔ (حیران ہوکر) آبرو لکھنوی اور شاکر نجومی عجیب حسن اتفاق ہے۔

ہمزاد:۔ (نوکر سے) انہیں کہو کہ اوپر تشریف لے آئیں۔

(شاکر نجومی خوبصورت نوجوان ہیں۔ جن کے ہاتھ میں ایک گراموفون ریکارڈ ہے۔ آبرو لکھنوی باوقار بزرگ ہیں۔)

شاکر نجومی:۔ السلام علیکم۔ اوہو جبیر صاحب بھی تشریف فرما ہیں۔

آبرو لکھنوی:۔ (طوائفوں کو دیکھ کر) آہا ہا محفل گرم ہے۔

شاکر نجومی:۔ محفل نہیں۔ اندر سبھا کہئے۔

آبرو لکھنوی:۔ پریوں کا جھرمٹ ہے۔

ہمزاد:۔ اچھا پہلے پی جائے اور پھر شعر و شاعری پر تبادلۂ خیالات.....

جبیر مطلب آبادی:۔ (شاکر نجومی سے) یہ آپ کے ہاتھ میں کیا ہے۔

شاکر نجومی:۔ یہ میری نظم "گھسیارن" کا ریکارڈ ہے۔ جسے میں نے پچھلے ہفتہ اپنی آواز میں ریکارڈ کیا ہے۔

جبیر:۔ اوہو "گھسیارن" کا ریکارڈ۔ ذرا سنئیں۔

ہمزاد:۔ (نوکر سے) ارے جمن لانا ذرا گراموفون۔

آبرو لکھنوی:۔ جبھی جب تک گراموفون آئے، ساغر کو ہی گردش میں لایا جائے۔

(زہرہ جبین اشارہ پاکر ساقی کے فرض بجا لاتی ہے۔ گراموفون آنے پر شاکر نجومی ریکارڈ کو بجاتے ہیں)

میں گھسیارا۔ تو گھسیارن

میں ہے پیارا تیرے کارن

تو گھسیارن، میں گھسیارا

گھاس سے بھر دیں یہ جگ سارا

گھاس پہ لیٹیں۔ گھاس پہ سوئیں

گھاس پہ ناچیں۔ گھاس پہ روئیں

گھاس کی کٹیا، گھاس کا مندر

گھاس کا بُت ہو جس کے اندر

گھاس کا آنگن۔ گھاس کی چھت ہو

گھاس کا اک اونچا پربت ہو

جبر:۔ واللہ کیا نازک خیالی ہے۔ تخیل کے ساتھ زبان کیسی ستھری ہے

آبرو لکھنوی:۔ شاکر نجومی کا کلام اب کافی سلیس ہوتا جاتا ہے۔ میں خوش ہوں کہ وہ اب اپنی نظمیں "خالص اردو" میں لکھتے ہیں۔

ہمزاد اور جبر:۔ خالص اردو؟

آبرو لکھنوی:۔ میرا مطلب ہے۔ ایسی اردو جس میں عربی اور فارسی کے الفاظ

بہت کم پائے جاتے ہیں۔

جبیر:۔ آپ کا مطلب ہے جس قسم کی اُردو آپ لکھتے ہیں۔

آبرو:۔ ہاں ذرا اس نظم کی خوبی ملاحظہ فرمایئے۔ یہ میں نے ایک فلم کے لئے لکھی۔

ہمزاد اور جبیر:۔ ارشاد۔

آبرو لکھنوی:۔ عنوان ہے "ہیرے پھیرے" عرض کیا ہے۔

میں کرتا ہوں کھیتوں کے کیوں ہیرے پھیرے
مجھے پھانسنے ہوں گے شاید بٹیرے

(جبر اور ہمزاد زیرِ لب مسکراتے ہیں)

آبرو:۔

سمجھتا ہوں میں۔ میں سمجھتا ہوں ان کو
کہ یہ شعر میرے ہیں بس شعر میرے

شاکر نجومی:۔ واللہ یہ شعر کوئی اور کہے تو خون تھوک دے۔

آبرو لکھنوی:۔ یہ شعر سنئے۔ بالکل خالص اُردو میں ہے

چلے جا رہے ہیں وہ پہلو سے اُٹھ کر
میں لاتا ہوں رستہ کوئی ان کو گھیرے

جبیر:۔ اے سبحان اللہ۔ کیا جدّتِ تخیل ہے۔ زورِ بیان ملاحظہ ہو۔

آبرو لکھنوی:۔ مقطع عرض کرتا ہوں

مرے دوست اندھے ہیں میں اُن میں کانا
یہ کیا کہہ گیا میں۔ ارے رے۔ ارے رے

شاکر نجومی:۔ واقعی مقطع میں کوئی عربی اور فارسی کا لفظ نہیں۔ سوائے دوست کے

ہمزاد:۔ اجی چھوڑیئے یہ خالص، ناخالص کا جھگڑا۔

(اچانک باہر سے شور وغل کی آوازیں سنائی دیتی ہیں)

جبرا:۔ کیا کوئی جلوس ہے۔

ہمزاد:۔ شاید کوئی بلوہ ہوگیا۔

شاکر نجومی:۔ ضرور ہندو مسلم فساد ہوگا۔

(شور وغل کی آوازیں زیادہ صاف اور بلند ہوتی جاتی ہیں)

ہمزاد:۔ ارے یہ تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگ میرے مکان کے قریب آ پہنچے۔

(اب شور وغل مکان کی سیڑھیوں سے بلند ہوتا سنائی دیتا ہے)

ہمزاد:۔ ہائیں۔ یہ تو ہمارے کمرے کی طرف آرہے ہیں۔

شاکر نجومی:۔ آنے دو۔ کوئی پروا نہیں۔

(دروازہ کھلتا ہے تیس چالیس آدمیوں کا ہجوم اندر داخل ہوتا ہے ہجوم کے آگے دو لیڈر ہیں جنہوں نے سرخ جھنڈے اٹھائے ہوئے ہیں۔ باقی لوگوں کے ہاتھوں میں ہتھوڑے۔ درانتیاں اور کلہاڑے ہیں ان کو دیکھ کر طوائفیں ڈر کر شاعروں کے ساتھ چمٹ جاتی ہیں)

ہمزاد:۔ (ڈرتے ہوئے) میرے اللہ یہ کیا آفت ہے (لکنت آمیز لہجے میں)

آپ کون ہیں۔

ایاز لکھنوی:۔ (گرج کر) مزدور ہیں ہم۔ مزدور ہیں ہم۔

دلی سردار غافلی:۔ دنیا میں قیامت لائیں گے

ہر نقش کہن کو ڈھائیں گے

ہجوم کے باقی افراد :۔ مزدور ہیں ہم۔ مزدور ہیں ہم

جنبر مطلب آبادی :۔ اگر آپ واقعی مزدور ہیں تو جائیے مزدوری کیجئے۔ یہاں کس لئے آئے ہیں ؟

ایاز لکھنوی :۔ اس سوال کا جواب ہمارے ہتھوڑے۔ درانتیاں اور کلہاڑے دیں گے۔

(ہجوم سے)

توڑ دو ساغر و مینا۔ پھوڑ دو جام و سبو
مٹا دو نظامِ کہن کو

(ہجوم کے افراد ہتھوڑوں سے ساغر و سبو کو توڑتے ہیں)

ہمزاد :۔ (صدائے احتجاج بلند کرتا ہوا) اجی ایاز صاحب۔ یہ بوتل مت توڑیئے اس میں میری بہترین شراب ہے۔

ولی سردار غافلی :۔ انڈیل دو اس شراب کو گندی نالی میں۔

شاکر نجومی :۔ (پیالہ آگے بڑھا کر) خدا کے لئے بیش قیمت شراب کو ضائع نہ کیجئے۔ اس میں ڈال دیجئے۔

ایاز لکھنوی :۔ (طنزاً) مزدوروں کے رہنما۔ انقلاب کے علمبردار۔ فرسودہ روایات کے دشمن! تو ۔۔۔؟ اور اس محفل میں ؟ ؟

شاکر نجومی :۔ (کھسیانہ ہو کر) ایاز صاحب .... کیا کہوں .... توبہ کئے مدت ہو گئی تھی۔ یونہی آج منہ کا ذائقہ بدلنے کے بہانے چلا آیا۔

ولی سردار غافلی :۔ خوب۔ اور ابھی باہر جا کر 'مزدور زندہ باد' کا نعرہ بلند کر دو گے۔ تم شاکر نجومی نہیں۔ شاکر ہرجائی ہو۔

ہمزاد:۔ مگر غافلی صاحب، یہ تو بتایئے۔ ہماری خطا کیا ہے ہمیں کس جرم کی سزا مل رہی ہے۔

ایاز لکھنوی:۔ تمہاری خطا، تمہیں جیسے معلوم نہیں۔ تم جاگیردارانہ نظام اور ذہنیت کے پرستار ہو۔ تمہیں غزل گوئی اور مے نوشی کے سوا کوئی بات سوجھتی ہی نہیں۔ ادھر ہم ہیں۔ کہ بھوکے مر رہے ہیں۔ شہر میں مزدوروں کو آٹا نہیں ملتا۔ اور یہاں ساغر و مینا کا شغل جاری ہے۔

جبر مطلب آبادی:۔ مگر اس میں ہمارا کیا قصور ہے۔

دلی سردار غافلی:۔ اس کا جواب ہمارے ہتھوڑے دیں گے۔ (ہجوم سے) توڑ دو اس مکان کی کھڑکیاں۔ روشندان۔ میزیں لیمپ، کرسیاں،....

ایاز لکھنوی:۔ (جبر اور ہمزاد سے مخاطب ہوکر) ہر وقت غزل گوئی۔ ہر وقت گیت۔ حسن و عشق۔ محفل رقص و سرود۔ طوائفیں۔ خوش گپیاں۔

ہمزاد:۔ مگر ایاز صاحب، ہم نے نعتیں اور نعتیہ نظمیں بھی تو لکھی ہیں۔

ایاز لکھنوی:۔ وہ سب مکر ہے۔ فریب ہے۔ تم ہمیں اس طرح دھوکا نہیں دے سکتے۔

دلی سردار غافلی:۔ تمہیں اپنی روش کو بدلنا پڑے گا۔

ایاز لکھنوی:۔ (ہتھوڑا دکھا کر) نہیں بدلوگے تو زمانہ تمہیں حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا جائے گا

ہمزاد:۔ مگر ایاز صاحب، شروع میں تو آپ بھی ہماری طرح لکھتے تھے۔

ایاز لکھنوی:۔ ہاں اُس وقت میں شاعر تھا مگر اب میں مزدور ہوں۔

دلی سردار غافلی:۔ (ایاز سے) میرا خیال ہے۔ اب ہیڈکوارٹرز کو چلیں۔

ایاز لکھنوی :- (بہم سے) چلو- ہاں- ساتھیو گاؤ-

ہم ساغر و مینا توڑیں گے ہر راہ پرانی چھوڑیں گے

الحاد سے رشتہ جوڑیں گے

مزدور ہیں ہم مزدور ہیں ہم

ولی سردار فاضل :-

گو بھوکے ہیں گو ننگے ہیں گو جاہل ہیں گو گندے ہیں

پھر بھی اللہ کے بندے ہیں

مزدور ہیں ہم مزدور ہیں ہم

(گاتے گاتے باہر نکل جاتے ہیں)

نئے چراغ نئے گلے

دلّی کی خاص چیز نہ لال قلعہ ہے نہ خواجہ حسن نظامی۔ نہ قطب مینار۔ نہ ڈاکٹر ذاکر حسین۔ دلّی کی خاص چیز ہے۔ دلی کا گائیڈ (Guide)۔ واماندہ شکستہ حال سوختہ ساماں۔ دِلّی کا گائیڈ آپ کو اُن وقتوں کی یاد دلاتا ہے۔ جب دلّی دلّی تھی۔ جب دلّی میں حکیم کم تھے اور شاعر زیادہ۔ گاڑی سے اُترتے ہی وہ آپ کو آن دبوچتا ہے۔ اور اُس وقت تک آپ کا تعاقب کرتا ہے جب تک آپ دلّی سے بھاگ کھڑے نہیں ہوتے۔ وہ آپ کو دلی کی صرف ایک دن میں سیر کرا سکتا ہے۔ بارہ گھنٹے میں تمام تاریخی عمارات دکھا سکتا ہے۔ اور اگر آپ کے پاس بہت کم فرصت ہے۔ تو صرف چھ گھنٹے میں دلی اور دلّی والے دکھا سکتا ہے۔ وہ بہت قلیل معاوضہ میں آپ کے ساتھ صبح سے شام تک گھوم سکتا ہے خضر راہ بن کر آپ کو بازارِ حسن میں پہنچا سکتا ہے۔ اور ضرورت پڑنے پر آپ کی جیب تک کتر سکتا ہے سب سے پہلا سوال جو وہ آپ سے

کرتا ہے" آپ دِلّی کس غرض سے تشریف لائے ہیں۔ سیر و تفریح کے لئے محکمہ سیڈیو میں ملازمت کرنے کے لئے۔ فوج میں بھرتی ہونے کے لئے" دلی کا گائیڈ جہاندیدہ بزرگ ہے۔ اُسے اچھی طرح معلوم ہے۔ کہ سوائے ان مقاصد کے کسی شخص کو دِلّی میں کوئی کام نہیں۔

دلّی کے گائیڈ کی معلومات وسیع اور واقفیت حیرت انگیز ہوتی ہے۔ عموماً وہ فصیل کو صفیل اور ظفر کو جفر کہتا ہے۔ تاریخ پر اُسے خاص عبور حاصل ہوتا ہے چنانچہ بسا اوقات وہ آپ کو کسی بنجر یا ویران جگہ میں لیجا کر یک لخت رُک جاتا ہے اور سفید زمین کی طرف اشارہ کرکے کہتا ہے" اس جگہ پر جہاں آپ کھڑے ہیں مہارانی جودھابائی کا محل تھا" آپ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھنے کے بعد کہتے ہیں" مجھے تو یہاں دُوربین کی مدد سے بھی میلوں تک محل کا کوئی نشان نظر نہیں آتا" دِلّی کا گائیڈ آہ سرد کھینچ کر کہتا ہے" صاحب۔ چرخ کج رفتار نے اِس فلک بوس محل کو خاک میں ملا دیا۔ زمانہ کی دست برد سے اگر کچھ بچا۔ تو یہ اینٹ بچی" اس کے بعد آپ کو ایک اینٹ اٹھا کر دکھاتا ہے۔ جو اس کے قول کے مطابق مہارانی کی خوابگاہ کی اینٹ ہے عموماً دلی کا گائیڈ اپنے کمالات کا مظاہرہ اُس وقت کرتا ہے۔ جب آپ کو لال قلعے کی سیر کراتا ہے۔ اُس وقت اُس کی فصاحت کا یہ حال ہوتا ہے کہ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی" یہاں نورجہاں کا حمام تھا۔ وہاں فلاں پری پیکر لونڈی کا غسل خانہ تھا۔ اُس گوشے میں ہاتھیوں کی لڑائی ہُوا کرتی تھی۔ یہاں نازنیں بیگم شطرنج کھیلتی تھیں" دلّی کا گائیڈ مغلوں کے شجرۂ نسب میں حسب ضرورت ترمیم بھی کرسکتا ہے۔ مثلاً یہ جہاں آرا کا مزار ہے۔ جو نورجہاں کی بیٹی تھیں۔ یہ

محمد شاہ رنگیلے کی قبر ہے۔ جو فرخ سیر کے بھتیجے تھے۔ مختصر یہ کہ دلی کا گائیڈ نہایت دلچسپ آدمی ہے۔ اور دلی کی عظمت کا سب سے بڑا امین۔۔۔۔۔

جہاں تک حسن کا تعلق ہے۔ دلی ایسا شہر ہے۔ جہاں بقول غالب کوئی "صورت" نظر نہیں آتی۔ آمنے سامنے۔ دائیں بائیں جدھر آپ نگاہ ڈالتے ہیں آپکو دبلی پتلی سیاہ فام مخلوق نظر آتی ہے حتیٰ کہ آپکو غالب کی بے پناہ طنز کی داد دینا پڑتی ہے کہ سے یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں۔ اور کبھی تو گھبرا کر آدمی یہ سوچنے لگتا ہے کہ داغ دہلوی نے یہ کہہ کر کہ جسے داغ کہتے ہیں۔ بتوں کی آفت میں کیا اضافہ کیا کیونکہ رو سیاہی جس چیز کا نام ہے قدرِ دہلوی کے حصے میں آئی ہے۔ ———————

——————— جسمانی لحاظ سے اہل دہلی کو دیکھ کر یہ شبہ ہوتا ہے۔ کہ قحط کلکتہ میں نہیں دلی میں پڑا تھا۔ قیاس اغلب ہے۔ کہ غالب دہلوی کے زمانے سے جنہوں نے کہا تھا سے ہم نے مانا کہ رہیں دلی میں پر کھائیں گے کیا دلی میں کھانے پینے کی چیزوں کی قلت رہی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا ہے۔ کہ ہر دہلوی "کنجشک فرو مایہ" بن کر رہ گیا ہے۔ جسے کبھی حالت میں بھی "شاہین" سے لڑایا نہیں جا سکتا!

یادش بخیر۔ دلی کے بزرگ بھی کمال کے آدمی ہیں۔ ہونٹوں پر پان کا لاکھا آنکھوں میں سیاہ یا سبز سرمہ۔ شرعی داڑھی۔ ململ کی ٹوپی۔ تنگ موری کا پاجامہ لمبی اچکن۔ تکلف اور شرافت کے پتلے۔ دلی کے بزرگ ماقبل اگلے وقتوں کے لوگ ہیں۔ جنہیں کچھ بھی نہیں کہنا چاہیئے۔ وضعداری کا یہ حال ہے۔ کہ اس گئے گذرے زمانے میں جب کہ چھالیا پر ٹیکس لگ چکا ہے۔ آپ کو پان پیش کرنے سے باز نہیں آتے۔ اپنی ہر گفتگو کا آغاز اس فقرہ سے کرتے ہیں: غدر سے پہلے کی

بات ہے۔" یا "بزرگوں کی زبانی سنا ہے۔" چنانچہ ان کی زبان سے "غدر سے پہلے" کا ذکر اس قدر سننے میں آتا ہے۔ کہ آپ یہ محسوس کرتے ہیں۔ کہ دلی میں جو کچھ ہوا غدر سے پہلے ہوا۔ یوں تو انہیں دلی کا ہر بادشاہ اور ہر کوچہ عزیز ہے۔ تاہم ظفر اور کوچہ چیلاں کے عاشق ہیں۔ ظفر کی جلا وطنی کی داستان سناتے وقت ان کی داڑھیاں آنسوؤں سے تر ہو جاتی ہیں اور کوچہ چیلاں! اسے انگریز میر سید میں ملا کئے گئے

دلی میں ایک پنجابی کو جو چیز سب سے زیادہ مرعوب کرتی ہے۔ وہ زبان اور محاورہ کا چٹخارہ ہے۔ سبحان اللہ ایسی ایسی عجیب و غریب ترکیبیں اور محاورے سننے میں آتے ہیں۔ کہ سر دھننے کو جی چاہتا ہے۔ روزمرہ میں دو الفاظ کثرت سے استعمال ہوتے ہیں "صاحب" اور "اماں"۔ "ہاں صاب" اور "ناصاب" تقریباً ہر فقرے کے جزو لاینفک ہیں۔ اور بے تکلف دوستوں میں لفظ "اماں" نہایت فراخدلی کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے۔ تذکیر و تانیث کی کوئی قید نہیں۔ ابا کو بھی اماں۔ بیوی کو بھی اماں۔ بچے کو بھی اماں۔ جوان کو بھی اماں دراصل یہ لفظ اتنا کار آمد ہے۔ کہ ہر موقع پر استعمال ہو سکتا ہے۔ نئے نئے محاورے ایجاد کرنے میں اہل دلی کا کوئی ہم پلہ نہیں۔ جن دنوں میں دلی گیا۔ یہ دو محاورے مقبول ہو رہے تھے۔ "گھسیٹن میں پڑنا" اور "کھنڈت ڈالنا" تقریباً ہر شخص ان محاوروں کو اپنی گفتگو میں استعمال کرنا نہ صرف فخر خیال کرتا تھا۔ بلکہ فرض بھی۔ چنانچہ تانگے والے سے لیکر بڑے بڑے اہل قلم تک گھسیٹن میں پڑنے سے ڈرتے تھے۔ خدا جانے گھسیٹن کیا بلا تھی۔ مگر دلی میں جو بھی تھا۔ اس سے خوفزدہ نظر آتا تھا۔ "اجی میں کیوں خواہ مخواہ گھسیٹن میں پڑوں۔" یہ گھسا

ہوا ذرٹ آپ سے لیکر؛ ایک دکان دار نے مجھ سے کہا۔ صاحب۔ ہم تو یہ مکان خرید کر کمیشن میں پڑ گئے؛ ایک بزرگ کسی سے فرمارہے تھے۔ ایک پنواڑن اپنی سہیلی سے کہہ رہی تھیں یہ بہن میں تو اس سے شادی کر کے کمیشن میں پڑ گئی؛ یہ محاورہ اتنی بار سُنا کہ اشتیاق ہوا۔ اس کا مطلب کسی بزرگ سے دریافت کروں چنانچہ ایک اہلِ قلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مگر اُنہوں نے یہ کہہ کر ٹال دیا: "اجی صاحب۔ آپ کو محاوروں کے مطالب سے کیا لینا دینا۔ آپ خواہ مخواہ کیوں کمیشن میں پڑتے ہیں؛"

دلی میں داغ دہلوی کے بعد کوئی شاعر نہیں ہوا۔ اقبال نے سچ کہا تھا ؎
آخری شاعر جہاں آباد کا خاموش ہے۔ شعرا کی بجائے اب قوالوں اور حکیموں کا دور دورہ ہے۔ تقریباً ہر بازار ہر کوچہ ہر گلی میں مسیح الملک حکیم اجمل خاں کا ایک آدھ جانشین آپ ضرور موجود پائیں گے۔ دلی کے اردگرد قبریں اور مقبرے ہیں اور دلی کی چار دیواری کے اندر حکیم۔ دلی کے قوال عام لوگوں سے زیادہ سیاہ فام ہوتے ہیں۔ اور گاتے وقت اس قسم کی مضحکہ خیز شکلیں بناتے ہیں۔ کہ چاہے وہ مرثیہ ہی گارہے ہوں ہنستے ہنستے آپ کے پیٹ میں بل پڑ جائیں۔ پرانے وقتوں میں جب کوئی شخص دلی جاتا۔ تو اساتذہ کا کلام تبرک کے طور پر وہاں سے وطنِ مالوف لایا کرتا تھا۔ چنانچہ میں نے بھی اسی خیال کے پیشِ نظر ایک قوال سے درخواست کی۔ کہ ایک آدھ شعر عنایت فرمائیں۔ پہلے تو اُنہوں نے میری التجا کو قابلِ التفات ہی نہ سمجھا۔ لیکن جب بہت منت سماجت کی۔ تو اُنہوں نے ایک شعر سے۔ (جسے شعر نہیں دراصل نشتر کہنا چاہیئے) مجھے نوازا:-

ملاحظہ فرمائیے:۔

شعر

اجی ہاں۔ ہاں۔ ہاں۔ مجھے دیوانہ کر دیا
اجی ہاں۔ ہاں۔ ہاں۔ مجھے بیگانہ کر دیا

آپ بھی اس شعر سے لطف اٹھائیے۔ اور حضرت چمن قوال کے حق میں دعائے خیر کیجئے کہ جو داغ دہلوی کے بعد دلی کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔

. . . .

خدا آباد رکھے دلی کو کہ گلشن کی طرح پھر غنیمت ہے۔ کوئی نہ کوئی اچھی صورت نظر بھی آئے تو کیا مضائقہ ہے۔ کوئی نہ کوئی اچھی قبر نظر آ ہی جاتی ہے۔ دلی تو اجڑا دیار ہے نہ زلف، بعد گلزار نہ دلی ایک مقبرہ ہے بسیط و عریض....

شعر

پڑی ہیں آنکھیں جو پہلے جگہ تھی نرگس کی
خبر نہیں کہ اب ہے کہاں گئی نظر کس کی

چند مقبولِ عام فلمی سین

(۱)

محبّت کا سین

مجنوں:۔ مجھے تم سے کچھ کہنا ہے لیلیٰ۔

لیلیٰ:۔ یہی نہ کہ تمہیں مجھ سے محبّت ہے۔

مجنوں:۔ محبّت نہیں بلکہ ......

لیلیٰ:۔ (بات کاٹ کر) والہانہ عشق ہے۔

مجنوں:۔ میری پیاری لیلیٰ۔ تم کتنی اچھی ہو۔

لیلیٰ:۔ شکریہ۔ لیکن مجھ سے بغلگیر ہونے کی کوشش مت کرو۔ وہیں کھڑے کھڑے میری طرف دیکھ کر مسکراتے رہو۔

مجنوں :۔ مگر یہ کیوں ؟

لیلےٰ :۔ تم کتنے سادہ لوح ہو مجنوں۔ اتنا بھی نہیں جانتے۔ کہ اگر تم نے مجھے اپنے بازوؤں میں بھینچنے کی کوشش کی۔ تو عوام کا اخلاق تباہ ہو جائے گا۔ یہ ہندوستان ہے پیارے۔ فرانس نہیں۔

مجنوں :۔ مگر میں اپنی محبت کا اظہار کس طرح کروں۔

لیلےٰ :۔ میں بتاؤں۔ آؤ باغیچہ میں چلیں۔ میں آگے آگے بھاگتی ہوں۔ تم میرا تعاقب کرو۔

مجنوں :۔ اچھا خیال ہے۔

لیلےٰ :۔ ہاں لیکن، یاد رہے۔ تمہیں بوس و کنار سے قطعاً احتراز کرنا ہے۔ ورنہ۔۔

مجنوں :۔ ورنہ یہی نہ کہ باپ اور بیٹی یہ فلم ملکر نہ دیکھ سکیں گے۔

لیلےٰ :۔ ہاں۔

مجنوں :۔ لیکن لیلےٰ اگر میں وفورِ محبت سے بیتاب ہو جاؤں تو۔

لیلےٰ :۔ اُس حالت میں تم اپنا سر میرے کندھے پر رکھ سکتے ہو۔

مجنوں :۔ شکریہ۔ لیکن تم اپنی محبت کا اظہار کیسے کرو گی۔

لیلےٰ :۔ اسکی فکر نہ کرو۔

مجنوں :۔ پھر بھی۔

لیلےٰ :۔ ہم دونو ایک بے معنی دوگانا (Duet) گائیں گے۔ اس سے عوام کو پتہ چل جائے گا۔ کہ ہمیں ایک دوسرے سے محبت ہے۔

مجنوں :۔ مثلاً۔

لیلیٰ :۔ مثلاً میں کہوں گی۔ ؎ میں دیوانی ہوں۔ دیوانی
مجنوں :۔ اور اس کے جواب میں شاید مجھے کہنا ہوگا ؎

میں دیوانہ ہوں۔ دیوانہ

لیلیٰ :۔ ہاں۔ اور پھر میں کہوں گی ؎ میری چھوٹی چھوٹی آنکھیں۔
مجنوں :۔ اور میں فوراً بول اٹھوں گا ؎ میری پتلی پتلی ٹانگیں۔
لیلیٰ :۔ اس کے بعد میں بھاگ کر درخت پر چڑھ جاؤں گی۔ اور پتوں میں چھپ کر تیسرا مصرع پڑھوں گی ؎ پریت کی ریت نبھاؤ ساجن
مجنوں :۔ اور میں نیچے سے پکار کر کہوں گا ؎ اور نہ اب تڑپاؤ ساجن
لیلیٰ :۔ اس کے بعد میں قہقہہ لگا کر ہنسنے لگوں گی۔
مجنوں :۔ اور میں فرطِ محبت سے درخت سے بغلگیر ہو جاؤں گا۔
لیلیٰ :۔ اور اس طرح ہندوستانی فلموں میں ایک اور پاکیزہ فلم کا اضافہ ہو جائے گا!

(۲)

اِیثار کا سین

بیوی :۔ ناتھ آج آپ پھر رات گئے گھر آئے!
خاوند :۔ تمہیں معلوم ہی ہے۔ تین ماہ سے میرا یہی معمول بن چکا ہے۔
بیوی :۔ آپ کے منہ سے شراب کی بو بھی آرہی ہے ناتھ!
خاوند :۔ جوئے میں ہارنے کے بعد چارہ ہی کیا تھا۔ اگر دو چار گھونٹ نہ لیتا

تو غم سے مر نہ جاتا۔

بیوی :۔ ناتھ۔ آپ نے جوا کھیلنا بھی شروع کر دیا۔

خاوند :۔ تمہارے زیور بیچ کر آج پانچہزار کی رقم ہاتھ لگی تھی۔ میں نے سوچا۔ کہ ایک آدھ داؤ لگا دیکھوں۔

بیوی :۔ تو کیا آپ نے میرے سارے زیور بیچ ڈالے ؟

خاوند :۔ سارے نہیں پیاری۔ ابھی جھومر باقی ہے۔

بیوی :۔ ناتھ یہ آپ نے کیا کیا ؟

خاوند :۔ خاموش۔ ورنہ ابھی جوتوں سے تمہاری مرمت کروں گا۔

بیوی :۔ (انکساری ظاہر کرتے ہوئے) آپ بے شک مجھے جوتے لگائیے۔ میں کبھی ناراض نہ ہوں گی۔ بلکہ یہی چاہوں گی۔ کہ ......

خاوند :۔ کہ میں تمہیں اور جوتے لگاؤں۔

بیوی :۔ ہاں۔ اور جب تم جوتے لگا کر مجھے ادھموا کر دو گے۔ تو میں بھگوان سے پرارتھنا کرونگی۔ کہ۔

خاوند :۔ کہ اگر مرنے کے بعد تمہارا پھر جنم ہو۔ تو تم میری بیوی بنو۔

بیوی :۔ ہاں۔ اور مرتے وقت میرا سر آپ کے چرنوں میں ہو۔

خاوند :۔ شاباش۔ اگر تم اتنی بیوقوف نہ ہوتیں۔ تو میں کب کا سدھر نہ گیا ہوتا۔

(۳)

نصیحت آموز سین

عاشق:- میری جان۔ اب میں اپنی ساری دولت تمہاری نذر کر چکا۔ اب میرے پاس کچھ نہیں؟

رنڈی (غصّے سے) کچھ نہیں؟ تو پھر یہاں کیوں آئے ہو۔

عاشق:- اس لئے کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے۔

رنڈی:- کیا تمہیں معلوم نہیں۔ کہ مفلس عاشقوں کے لئے اس گھر میں کوئی جگہ نہیں۔

عاشق:- میرا خیال تھا۔ تم دل وجان سے مجھ پر فدا ہو۔

رنڈی:- بیوقوف۔ رنڈی کی نگاہ عاشق کے دل پر نہیں بلکہ اُس کی جیب پر ہوتی ہے۔

عاشق:- میرا خیال تھا۔ تم عام بازاری عورتوں سے مختلف ہو۔

رنڈی:- یہ تم نے کیسے فرض کر لیا۔ ... چلے جاؤ یہاں سے

عاشق:- (گڑگڑا کر) پیاری میری حالتِ زار پر رحم کھاؤ۔ میں نے تمہارے لئے اپنا مکان بیچ ڈالا۔ بیوی کے زیور فروخت کر دیئے۔ ڈاکہ مارا۔ ساس اور سسر سے لڑائی مول لی۔ بیوی کو مار مار کر نیم بسمل کر دیا۔

رنڈی (غصہ سے) جاتے ہو۔ یا تمہیں دھکے مار کر نکالا جائے۔

عاشق :۔ اچھا۔ پیاری جاتا ہوں۔ لیکن رخصت ہونے سے پہلے ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں۔

رنڈی :۔ کیا۔

عاشق :۔ وہ یہ کہ گھر سے نکلتے وقت میری پشت پر اس زور سے لات جمانا۔ کہ میں سیڑھیوں پر سے لڑھکتا ہوا بازار میں جا پڑوں۔

رنڈی :۔ یہ کیوں ؟

عاشق :۔ تاکہ دیکھنے والوں کو عبرت ہو۔

رنڈی :۔ اچھا۔ اب میں سمجھی تم نے کس لئے گھر بار لٹایا۔۔۔۔۔ اسی لئے تا۔ کہ جب تم اپنی ساری دولت لٹا چکو۔ اور بالکل دیوالیہ ہو جاؤ۔ تو لوگ تم سے عبرت حاصل کریں۔

عاشق :۔ تم ٹھیک سمجھیں۔۔۔۔۔ اچھا اب لگاؤ لات !۔۔۔۔۔

(۴)

بے مثال قربانی کا سین

رمیش :۔ لیلا تمہیں معلوم ہی ہے۔ مجھے تم سے کتنی محبت ہے۔

لیلا :۔ اور تم جانتے ہی ہو رمیش۔ مجھے تم سے کس قدر نفرت ہے۔

رمیش :۔ ہاں یہ غالباً اس لئے کہ تمہیں سریش سے عشق ہے۔

لیلا :۔ یہ ضروری ہے رمیش کیونکہ اگر میں ایسا نہ کروں۔ تو محبت کی تکون

کس طرح مکمل ہوگی۔

رمیش:۔ مگر کیا اس مشکل کا کوئی حل نہیں۔

لیلا:۔ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا۔

رمیش:۔ اچھا مجھے سوچنے دو..... (چٹکی بجاکر) ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔ لیلا بھلا تمہیں معلوم ہے۔ آج کونسا تہوار ہے۔

لیلا:۔ آج راکھی ہے۔ وہ مبارک دن جب بہنیں اپنے بھائیوں کو راکھیاں پیش کرتی ہیں۔

رمیش:۔ ٹھیک۔ اچھا تم بھاگ کر ایک راکھی لے آؤ۔ اور میرے بازو پر باندھ دو۔

لیلا:۔ اب میں سمجھی! تو گویا آج سے تم میرے بھائی ہو۔

رمیش:۔ ہاں۔

لیلا:۔ بھیا۔

رمیش:۔ بہن۔

لیلا:۔ بھیا۔

رمیش:۔ بہن۔

لیلا:۔ رمیش۔ بھیا اور بہن کی گردان کو اچھی طرح رٹ لو۔ ایسا نہ ہو کہ تم مجھے بہن کی بجائے "میری پیاری" کہنا شروع کر دو۔

رمیش:۔ نہیں پیاری..... نہیں پیاری بہن..... یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔

(۵)

المناک سین

بوڑھا باپ :- میں مر رہا ہوں۔ اور وہ نالائق بازارِ حسن کے چکر کاٹ رہا ہے۔

بہو :- ایسا نہ کہئے پتا جی۔ ابھی آپ کے مرنے کے کون سے دن ہیں۔

بوڑھا باپ :- نہیں نہیں۔ اب میں زندہ نہیں رہنا چاہتا۔ اب میں خود مر جاؤں گا۔ اُف۔ اُف۔ میرا دل ...... میرا دل بیٹھا جا رہا ہے

بہو :- (سر پیٹ کر) آہ۔ پتا جی۔ آپ کو کیا ہو گیا۔ آپ کی تو ایک منٹ میں آنکھیں پتھرا گئیں۔ مجھے معلوم نہ تھا۔ کہ آپ اتنی جلدی...

بوڑھا باپ :- نہیں بیٹی۔ میں ابھی مرا نہیں۔ اتنی جلدی نہیں مر سکتا۔ کافی سخت جان ہوں۔ لیکن اُف اُف۔ میرے دل کو کیا....

بہو :- پتا جی۔ دل کو سنبھالئے۔ آپ کے سوا ہمارا کون ہے۔

بوڑھا باپ :- میں جانتا ہوں بیٹی۔ اسی لئے تو مرنے میں اتنی دیر لگا رہا ہوں۔ مگر یاد رکھو۔ یہ نالائق ..... یہ ناخلف ..... جس نے مجھے اتنا دکھ پہنچایا۔ کبھی سکھ نہیں پائے گا...... اُف میرا دم گھٹ رہا ہے۔

بہو :- (گھبرا کر) پتا جی۔ پتا جی۔

بوڑھا باپ :- (گرج کر) وہ کبھی سکھ کی نیند نہیں سوئے گا۔ جسے کبھی

قرار حاصل نہیں ہوگا۔ وہ تڑپ تڑپ کر مرے گا۔ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر۔۔۔۔
اُف میں چلا۔

بہو:۔ (چیخ کر) ہائے پتا جی۔ کیا آپ واقعی چل بسے۔

بوڑھا باپ:۔ (یک لخت آنکھیں کھول کر) گھبراؤ نہیں بیٹی میں ابھی بالکل ختم نہیں ہوا۔۔۔۔ ذرا میرے پاس آؤ۔

بہو:۔ کیا حکم ہے پتا جی۔

بوڑھا باپ:۔ دیکھو۔ اُس نالائق سے کہنا کہ میری ارتھی کو ہاتھ نہ لگائے۔ مجھے اپنے ہاتھوں سے آگ لگاتا بیٹی۔۔۔۔ اور جب۔۔۔۔ اُف۔ اُف۔

بہو:۔ (جلدی سے) اور جب پتا جی؟

بوڑھا باپ:۔ اور جب میری چتا روشن ہو جائے۔ تو کسی سادھو سے کہنا کہ پس منظر میں کوئی رقت انگیز گیت گا کر سنائے۔

بہو:۔ جو حکم پتا جی۔

بوڑھا باپ:۔ ایسا گیت جسے سن کر لوگوں کی آنکھوں میں آنسو آ جائیں۔

بہو:۔ جیسے یہ سب دُنیا ایک سرائے بابا۔

بوڑھا باپ:۔ ہاں۔ یہ گانا لوگوں کو بہت پسند آئے گا۔ اچھا تو اب میں واقعی مرنے لگا ہوں۔ اُف اُف اُف۔

بہو:۔ آہ پتا جی۔ آپ سچ مچ مر گئے۔ میں نے سمجھا تھا صرف مرنے کی ریہرسل کر رہے ہیں خیر کچھ بھی ہو۔ میں آپ کی روح کی تسکین کے لئے ایک گانا ضرور گاؤں گی۔ ؎

دنیا ایک سرائے بابا۔ دنیا ایک سرائے
جو بھی اس میں آئے۔ بابا
رو رو جان گنوائے۔ دنیا ایک سرائے
مرنے دے مرنے والے کو
مت کر ہائے ہائے بابا۔ دنیا ایک سرائے

میر کی شاعری کا نفسیاتی تجزیہ

(ایک پیروڈی)

میر کی شاعری پر متعدد تنقید نگاروں نے لکھا ہے۔ لیکن شاید اُن کی شاعری کا نفسیاتی تجزیہ پیش کرنے کا سہرا میرے سے ہی سر رہے گا۔ معلوم ہوتا ہے متقدمین نے فرائڈ اور میکڈوگل کی سائیکالوجی کا مطالعہ ہی نہیں کیا۔ شاید . . . . . فرائڈ اور میکڈوگل اُس وقت پیدا ہی نہیں ہوئے تھے . . . . . اگر پیدا ہو چکے تھے۔ تو . . . . متقدمین کے پاس اتنی استطاعت ہی کہاں تھی جو ان ماہرین نفسیات کے نظریوں کو سمجھ سکتے۔ وجہ کچھ ہی ہو اُن کی تنقید میں جو سطحی پن پایا جاتا ہے۔ اُس کا سبب یہی ہے۔ کہ وہ "نفسیات" سے بے بہرہ تھے۔

عموماً یہ کہا جاتا ہے۔ کہ میر کی شاعری پر حزن و یاس کی ایسی گھٹا چھائی ہے
جو بقولِ فانی "نہ کھلتی ہے نہ برستی ہے"۔ اِسکی وجہ اگلے وقتوں کے نقاد یہ بتاتے ہیں کہ میر کو
اوائل عمر میں ناقابلِ برداشت آلام و مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ میری رائے میں یہ وجہ
سراسر ناکافی ہے۔ آلام و مصائب سے تقریباً ہر شاعر کو دوچار ہونا پڑا ہے لیکن
میر جیسا سوز کسی شاعر کو نصیب نہیں ہوا۔

میر طبعاً اور فطرتاً نوحہ گر واقع ہوئے ہیں۔ اُن کے چھ دواین میں تقریباً
دو ہزار اشعار ایسے ملتے ہیں جن میں رونے کا رونا رویا گیا ہے۔ آخر میر اس قدر
کیوں روتے تھے؟ آپ کہہ سکتے ہیں کہ اُنہیں رونے میں لطف آتا تھا۔ مگر اُنہیں
رونے میں کیوں لطف آتا تھا؟ دیکھا آپ نے، اِس سوال کا جواب دینا اتنا
آسان نہیں . . . . رونے کا تجزیہ . . . کرنے کے لئے ہمیں کسی
ماہر نفسیات کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔ اور میکڈوگل سے بہتر ماہر نفسیات اور
کون ہو سکتا ہے۔ میکڈوگل لکھتا ہے۔ کہ جن لوگوں کو رونے میں لطف آتا ہے۔
عموماً اُنہیں مالیخولیا کی شکایت ہوتی ہے۔ لیجئے صاحب معاملہ صاف ہو گیا تو گویا میر کو
مالیخولیا تھا دیکھنا اب یہ ہے کہ میر اِس نامراد مرض میں مبتلا کیونکر ہوئے۔ ممکن ہے اُنہیں
یہ مرض ورثہ میں ملا ہو۔ اگرچہ ہمارے پاس اس بات کا کوئی ثبوت نہیں۔ یہ بھی
ممکن ہے۔ انہیں کوئی دماغی صدمہ پہنچا ہو۔ لیکن قیاس اغلب ہے کہ مالیخولیا کی
وجہ سیکس ریپریشن (Sex Repression) ہے۔ میر کو عطار کے لڑکے سے لیکر
عطار کے لڑکے تک تقریباً ہر لونڈے سے عشق تھا۔ مگر اُمید بر آنے کی کوئی صورت

نظر آتی تھی۔ اِس حالت میں اگر اُن کا دماغی توازن قائم نہ رہا تو کوئی تعجب نہیں۔ ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ میرؔ بسیار نویس تھے۔ اُنہیں شعر کہنے کا مرض تھا۔ اور جو شخص دو چار نہیں۔ بلکہ اکٹھے چھ دواوین لکھ مارے۔ اُس کا دماغی توازن کس طرح قائم رہ سکتا ہے۔ یاد رہے۔ کہ میرؔ نے یہ دواوین ردیف اور قافیہ کی پابندی میں لکھے۔ نظم معرّا یا نظم آزاد میں نہیں۔ معلوم ہوتا ہے۔ میر کو اِس بات کا علم تھا۔ ایک جگہ فرماتے ہیں۔ ؎

دوانہ ہو گیا تو میرؔ آخر ریختہ کہہ کہہ کر
نہ کہتا تھا میں اے ظالم کہ یہ باتیں نہیں بھلیاں

میکڈوگل کے خیال میں مالیخولیا کی۔ ۔ ۔ ۔ علامات یہ ہیں (۱) افسردگی (۲) بے خوابی (۳) نوحہ گری (۴) خودکشی کی خواہش (۵) جسم کا گھلنا۔ یہ پانچوں علامات میرؔ میں یا یوں کہیے میرؔ کی شاعری میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔ افسردگی کو ہی لیجیے۔ میرؔ کا مشہور شعر ہے۔ ؎

شام سے ہی بجھا سا رہتا ہے۔
دِل ہے گویا چراغ مفلس کا

سرِ شام میرؔ پر گہری افسردگی چھا جاتی ہے۔ آخر کیوں؟ شام کے وقت تو عموماً شاعر لوگ نہایت بشاش نظر آتے ہیں۔ کیونکہ اُس وقت وہ نئی نئی شیروانیاں پہن کر کلوں میں پان دبا کر مشاعروں میں جلوہ فروز ہوتے ہیں۔ اور پھر میرؔ کو تو خاص کر خوش ہونا چاہیئے تھا۔ کہ وہ مشاعروں کے بادشاہ تھے۔ مشاعرے تو کیا وہ تو عالم پر چھائے ہوئے تھے سے سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہُوا اسنا ہے

کہ "دل کے بجا سار ہنے" کا سبب یہ نہیں کہ انہیں مشاعرہ میں سودا سے ٹکر لینے کا ڈر تھا۔ وجہ وہی ہے۔ جو میکڈوگل نے بتائی ہے۔ یعنی مالیخولیا!

نوحہ گری میر کی شاعری کا جزو لاینفک ہے۔ اور میر ان لوگوں میں سے ہیں جو شبنم کی طرح نہیں۔ بلکہ ابرِ تر کی مانند روتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کچھ عرصہ کے بعد رونا میر کا روزگار ہو گیا تھا۔ فرماتے ہیں ؎

روتے پھرتے ہیں ساری ساری رات
اب یہی روزگار ہے اپنا

رونے کے موضوع پر میر نے لاجواب اشعار کہے ہیں۔ اور جب ہم ان اشعار کی فنی خوبیوں کی بجائے ان کے پس منظر کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو صاف پتہ چلتا ہے کہ میر کو مالیخولیا نے کہیں کا نہ رکھا تھا۔ اور بیچارے کی ساری عمر رونے میں کٹی۔ فرماتے ہیں ؎

عہدِ جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے۔ صبح ہوئی آرام کیا

اسی غزل میں ایک شعر ہے ؎

یاں کے سفید و سیہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے
رات کو رو رو صبح کیا۔ دن کو جوں توں شام کیا

گو یہ پتہ چلانا مشکل ہے۔ کہ وہ دن کو زیادہ روتے تھے یا شب کو۔ تاہم یہ ظاہر ہے۔ کہ رات کے وقت بلند آواز سے روتے تھے ؎

جو اس شور سے میرؔ روتا رہے گا
تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا

ایک اور غزل میں فرماتے ہیں ؎

کس کو میرے حال سے تھی آگہی
نالۂ شب سب کو خبر کر گیا

میرؔ کو ابر کی طرح رونے میں مزہ آتا تھا۔ اور وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ رونے کے معاملے میں اُنہیں ابر سے حسد بھی تھا۔ متعدد اشعار ہیں جن میں انہوں نے ابرِ تر کو چیلنج دیا ہے ؎

یوں دُور سے کھڑے ہو کیا معتبر ہے رونا
دامن سے باندھ دامن لے ابرِ تر ہمارا

؎

خوب ہے اے ابر یک شب آؤ باہم رویئے
پر نہ اتنا بھی کہ ڈوبے شہر کم کم رویئے

؎

جب رونے بیٹھتا ہوں تو کیا کسر رہے ہے
رومال دو دو دن تک جوں ابرِ تر رہے ہے

؎

دن رات میری آنکھوں سے آنسو چلے گئے
برسات اب کے شہر میں سارے برس رہی

اس قدر رونے کے باوجود اُن کو مرتے دم تک یہی حسرت رہی کہ وہ جی بھر کر نہیں روئے۔ ایک جگہ اِس بات کا گلا یوں کیا ہے۔ ؎

تھی مصلحت کہ... رُک کر ہجراں میں جان دیجئے
دل کھول کر نہ غم میں مَیں ایک بار رو دیا

مالیخولیا کے مریض کو عموماً بے خوابی کی شکایت ہوتی ہے یہی وجہ ہے۔ کہ میرؔ کو ساری ساری رات نیند نہیں آتی تھی۔ فرماتے ہیں۔ ؎

لگتی نہیں پلک سے پلک انتظار میں
آنکھیں اگر یہی ہیں تو پھر نیند ہو چکا

جسم کا گھلنا مالیخولیا کی نمایاں علامت ہے۔ غم میں گھُل گھُل کر میرؔ کا یہ حال ہو گیا تھا۔ کہ بیچارے کی شکل تک پہچانی نہیں جاتی تھی۔ ایک جگہ لکھتے ہیں۔ ؎

کیا میرؔ ہے یہی جو تیرے در پہ تھا کھڑا
غمناک چشم و خشک لب و رنگ زرد تھا

اِس شعر میں "کیا میرؔ ہے یہی" کا ٹکڑا قابلِ غور ہے۔ میرؔ اتنے نحیف ہو گئے ہیں۔ کہ اپنے آپ کو پہچان بھی نہیں سکتے۔ ایک اور جگہ فرماتے ہیں۔ ؎

قامت خمیدہ۔ رنگ شکستہ۔ بدن نزار
تیرا تو میرؔ غم میں عجب حال ہو گیا

عموماً جن لوگوں کو مالیخولیا ہوتا ہے۔ اُن پر خودکشی کا بھوت سوار رہتا ہے میرؔ نے بھی اِس خواہش کا اظہار متعدد اشعار میں کیا ہے۔ مثلاً ؎

تدبیر میرے عشق کی کیا فائدہ طبیب   اب جان کے ہی ساتھ یہ آزار جائیگا

میر مرنے پر تُلے ہوئے ہیں۔ اسلئے طبیب کو نزدیک پھٹکنے نہیں دیتے۔ ایک اور شعر میں صاف صاف کہتے ہیں۔ کہ وہ خودکشی کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ؎

کیا کروں ناچار ہوں مرنے کو اب تیار ہوں
دل کی روز و شب کی بیزاری سے جی گھبرا گیا

ایک شعر میں اُن لوگوں کو رشک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جو مر گئے ؎

جن جن کو تھا عشق کا آزار مر گئے
اکثر ہمارے ساتھ کے بیمار مر گئے

ایک شعر میں موت کو طعنہ دیا ہے ؎

ہو گئی شہر شہر رسوائی
اے مری موت تو بھلی آئی

یہ بات، واقعی عجیب ہے کہ "جنوں" اور "جوہر قابل" میں چولی دامن کا ساتھ ہے قدرت کی یہ ستم ظریفی ہے۔ کہ عموماً اہل کمال جسمانی لحاظ سے نامکمل اور دماغی لحاظ سے بیمار ہوتے ہیں۔ ہومر۔ ملٹن۔ سورداس اندھے تھے۔ بائرن لنگڑا۔ بی تھوون بہرہ۔ مائیکل اینجلو نیم پاگل۔ چارلس لیمب چھ ماہ پاگل خانے میں رہا۔ جان کیٹس اور سٹیونسن کو تپ دق تھا اور میر کو مالیخولیا۔

اب رہا یہ سوال کہ آیا میر کو واقعی مالیخولیا تھا۔ یا اگر انہیں مالیخولیا تھا۔ تو آیا اُنہیں اس بات کا علم تھا۔ ان دونوں باتوں کی تصدیق میر کے اشعار سے ہو سکتی ہے۔ مشہور روایت ہے کہ جب میر دہلی سے لکھنؤ تشریف لے گئے۔ اور وہاں پہلی مجلس مشاعرہ میں شریک ہوئے۔ تو لکھنوی شعرا نے آپ کا ضرورت سے

زیادہ مضحکہ اُڑایا۔ظاہر ہے۔لکھنوی شعرا اتنے بدمذاق نہیں تھے۔کہ میرا ایسے شاعر کا خواہ مخواہ مضحکہ اُڑاتے۔اور انہیں یہ کہنے پر مجبور کرتے۔ ؎

کیا حال چال پوچھو پُورب کے ساکنو!
ہم کو غریب جان ہنس ہنس پکار کے

اگر لکھنوی شعرا نے 'ہنس ہنس پکار کے' میر کا حال پوچھا۔تو اس کا واحد سبب یہ تھا۔کہ اُنہوں نے میر کو عالمِ دیوانگی میں دیکھا۔اُنہیں ہنسی میر کی وضع قطع پر نہیں بلکہ اُن کے دیوانہ پن پر آئی۔اِس روایت کے علاوہ اِس دعوے کے ثبوت میں میر کے متعدد اشعار موجود ہیں۔فرماتے ہیں۔ ؎

جب جنوں سے ہمیں توسل تھا
اپنی زنجیر پا ہی کا غل تھا

ایک اور شعر سنیئے:۔ ؎

زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی
اب سنگِ مداوا ہے اِس آشفتہ سری کا

ایک اور جگہ لکھتے ہیں۔ ؎

خردمندی ہوئی زنجیر ورنہ
گذرتی خوب تھی دیوانہ پن میں

اور پھر وہ بے مثال شعر ؎

پھر زلف ہوا پیچاں اے میر نظر آئی
شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی

معلوم ہوتا ہے کہ میر کو مالیخولیا کا دورہ موسم بہار میں پڑتا تھا۔ ایک شعر میں اس بات کی طرف اشارہ بھی کیا ہے۔ ؎

کچھ کرو فکر مجھ دوانے کی
دھوم ہے پھر بہار آنے کی

کچھ کرو فکر مجھ دوانے کی! مگر افسوس جن لوگوں کو اس دوانے کی فکر لازم تھی۔ انہوں نے مجرمانہ غفلت کا ثبوت دیا۔ میں کبھی کبھی سوچتا ہوں۔ اگر نواب آصف الدولہ چھ ماہ کے لئے میر کو کسی سینے ٹوریم میں بھیج دیتے تو․․․․․!

شیشہ و تیشہ

(مضامینِ طنز و مزاح)

کنہیا لال کپور

لالۂ صحرائی

صرف ایک خیال تھا جو کشاں کشاں مجھے آگرہ لے گیا۔ وہ یہ کہ اس سے
پیشتر کہ کوئی بے وقوف حملہ آور تاج محل کو اسلحہ خانہ سمجھ کر بموں کا نشانہ بنانے میں
اس کی زیارت کر لوں۔ گاڑی میں سوار ہونے سے پہلے ایک کرمفرما نے کہا۔
"آجکل پتلون اور ٹائی کی بجائے دھوتی یا لنگوٹی باندھ کر سفر کرنا چاہیئے۔" ڈبے میں
بیٹھ کر میں نے محسوس کیا کہ اُنہوں نے مبالغہ سے کام لیا تھا۔ کیونکہ دراصل انہیں
یوں کہنا چاہیئے تھا۔ کہ دھوتی یا لنگوٹی کی بجائے تیغ و کفن باندھ کر عزمِ سفر کرنا
چاہیئے۔ جونہی فرنٹیر میل لاہور کے اسٹیشن پر رُکی۔ آنٹر کلاس کے ڈبے پر بقول
شخصے ایک یلغار ہے کہ خدا خیر کرے۔ ڈبے میں سوار ہونا روایتی جوئے شیر
لانے سے کم نہ تھا۔ مگر ڈبے میں سوار ہونے کے بعد پتہ چلا۔ کہ تقریباً نصف ڈبہ

مجھ پر سوار ہے۔ دو بزرگ میری گود میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک لونڈا میرے کندھے پر۔ اور ایک حضرت اس سوچ میں تھے۔ کہ موقع ملے۔ تو میرے سر پر ٹرنک رکھ کر اس پر بیٹھ جائیں۔ اس حالت میں سونا تو کجا آنکھ جھپکنا بھی دشوار تھا۔ تاہم کسی نہ کسی طرح آنکھیں بند کر کے اپنے آپ کو یقین دلایا۔ کہ ہم محوِ خواب ہیں۔ معاً ریاض خیر آبادی کا ایک شعر یاد آیا۔ ؎

ہم بند کئے آنکھ تصور میں پڑے ہیں
ایسے میں کوئی چھم سے جو آ جائے تو کیا ہو

مزے لے لے کر شعر کو دہرایا۔ دل نے کہا۔ ضرور یہ شعر فرنٹیئر میل کے انٹر کلاس کے ڈبے میں ہوا ہوگا۔ مگر کیا بات ہے دوسرے مصرع کی ۔ "ایسے میں کوئی چھم سے جو آ جائے تو کیا ہو"۔ اگلے اسٹیشن پر چھم سے آنے کی بجائے کوئی دھم سے جو آیا تو ساری شیخی کرکری ہو گئی۔ ایک صاحب جو نہ صرف گھر کا بلکہ محلے بھر کا اسباب اپنے ساتھ لے آئے تھے۔ بزور بازو جو ڈبے میں سوار ہوئے۔ تو گویا بھونچال آیا۔ چشم زدن میں سب مسافر ٹرنکوں اور بستروں کے انبار کے نیچے دب کر رہ گئے۔ دوسروں پر خدا جانے کیا گذری۔ کم از کم میری سمجھ میں تو پہلی بار یہ بات آئی۔ کہ یہ ریلوے والے کیوں نیک و بد کو ہدایت کرتے رہتے ہیں۔ کہ چلتے ٹرین سفر کرنے سے احتراز کرو۔ سوچا کہ اس ہدایت کے ساتھ اگر اس فقرہ کا اضافہ کر دیا جائے تو تنبیہ زور دار ہو جائے: "اگر تمہیں اپنی گردن کی سلامتی درکار ہے"

آگرہ اُن خوش قسمت شہروں میں سے ہے۔ جن کے ایک چھوڑ تین ریلوے اسٹیشن ہیں۔ یعنی آگرہ شہر جسے آگرہ والوں کی اصطلاح میں "راجا کی منڈی" کہتے ہیں۔ آگرہ

فورٹ اور آگرہ چھاؤنی میں راجا کی منڈی نہ اُتر سکا۔ در اصل کسی نے اُترنے ہی نہ دیا مجبوراً آگرہ چھاؤنی اُترا۔ اور وہاں سے اکہ کر کے راجا کی منڈی پہنچا۔ اکہ مزے کی سواری ہے کہنے کو تو اس میں ایک آدھ آدمی بیٹھ سکتا ہے۔ مگر سچ پوچھئے تو صرف نصف آدمی ہی سفر کر سکتا ہے کیونکہ جبتک آپکی ٹانگیں اکے کے باہر نہ رہیں۔ آپ اکے میں بیٹھ ہی نہیں سکتے۔ اکے کے چلنے کا انداز یہ ہے۔ کہ ہر گام پر اسے منزل کا دھوکا ہوتا ہے۔ اکہ چلتا ہے۔ ٹھہر جاتا ہے پھر چلتا ہے۔ اور اس طرح ٹھہرتا ہے کہ چلنے کا نام نہیں لیتا۔ جس ہوٹل میں میں ٹھہرا۔ اُس کے صحن میں وزن کرنیکی ایک مشین رکھی تھی جس پر لکھا ہوا تھا: براہِ مہربانی اِس مشین میں آنہ مت ڈالیئے کیونکہ یہ مشین خراب ہے"۔ ہوٹل میں بوریا بستر ٹھیک کرنے کے بعد میں نے ایک حجام سے داڑھی بنانے کو کہا۔ اُس نے حجامت بناتے وقت اسنے چر کے لگائے۔ کہ تمام چہرہ لہولہان کر دیا۔ رخصت ہوتے وقت عفو طلب لہجے میں کہنے لگا۔ "معاف کیجئیگا صاحب۔ ذرا اُسترا خراب تھا"۔ شام کیوقت ایک دوست گھسیٹ کر ایک رقاصہ کے ہاں گانا سننے لے گئے۔ مگر بائی جی نے گانے سے انکار کر دیا۔ کہنے لگیں۔ "آج میں نہ گا سکونگی۔ میرا گلا خراب ہے" میں بوکھلا گیا۔ الہٰی یہ کیا ماجرا ہے۔ آگرہ میں جو چیز ہے۔ خراب ہے۔ لیکن مجھے جلد ہی اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ آگرہ میں تاج محل بھی ہے۔ تاج محل! یعنی وہ خوبصورت یونانی مجسمہ جسے محبت کے دیوتا کیوپڈ نے خود اپنے ہاتھوں سے تراشا۔ محبت کا دیوتا جس کا دوسرا نام شاہجہان صاحبقراں تھا۔ وہ لاثانی فنکار جس نے الفاظ کی بجائے سنگ مرمر میں شاعری کی۔ جس نے شراب۔ شعر۔ موسیقی اور نکہت کو سنگ و خشت میں سمو یا جس نے اپنی محبوبہ کے لئے ایسا خوبصورت مقبرہ بنایا۔ جو الف لیلہ کی حسین سے حسین شاہزادی کو نصیب نہ ہوا۔ تاج محل! حُسن کی وہ عدیم المثال بارگاہ جہاں عشق نے سجدہ کیا۔ اور زندہ

جاوید ہوگیا۔ تاج ۔۔۔ کو دیکھ کر تسکین ہوئی ۔

تاج کے علاوہ آگرہ میں اور کوئی کام کی چیز نہیں۔ کیونکہ آگرہ کا قلعہ دلی کے قلعہ کی نقل ہے اور جامع مسجد کے متعلق ہم اتنا بھی نہیں کہہ سکتے۔ اب رہے آگرہ کے باشندے۔ تو اُن کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر دنیا میں کوئی چیز تاج محل کی ضد ہو سکتی ہے تو وہ آگرہ کے باشندے ہیں۔ آبادی کا معتدبہ حصہ دھوبیوں اور نائیوں پر مشتمل ہے۔ بدصورتی اور اپنے عجیب عزیب لباس کے اعتبار سے آگرہ کی عورتیں اپنا ثانی نہیں رکھتیں۔ سڑک پر جب کبھی دھوبن نما شریف زادی کو جاتے ہوئے آدمی دیکھتا ہے تو اس کے منہ سے بے اختیار نکلتا ہے۔ " ہائے انار کلی" اور جب اُسکی نگاہ اُس ویرانے پر پڑتی ہے جس کے پہلو میں تاج کھڑا ہے۔ تو اُس کا جی چاہتا ہے کہ کاش اُس کے پاس الہ دین کا چراغ ہوتا۔ اور وہ اس خوبصورت عمارت کو اٹھا کر آہستہ سے راوی کے کنارے پر لا کر رکھ دیتا۔ آگرہ کسی حالت میں بھی تاج محل کا مستحق نہیں۔ تاج محل جیسے مقبرہ کے لئے پس منظر ہونا چاہیئے فردوس یا راوی کا کنارا !۔